نگار

مجلۂ علمیہ و ادبیہ

رئیس التحریر

نیاز فتحپوری

۱۔ **شعبۂ ترتیب**:۔ اس شعبہ سے جو مراسلت کی جائے (جس میں رسایل اخبار کا تبادلہ، ترسیل مضامین اور تمام وہ مکتوبات شامل ہیں، جنکا تعلق اڈیٹر سے ہے) —
اس میں براہ کرم یہ پتہ تحریر فرمائے :۔

حضرۃ نیاز فتحپوری۔ بھوپال

۲۔ **شعبۂ نشر و انتظام**:۔ اس شعبہ سے جو خطاب کیا جائے گا (جس میں ترسیل زر، درخواست خریداری، مضامین اشتہار وغیرہ شامل ہیں) اس کا پتہ یہ ہوگا

حافظ امام الدین۔ من ٹولہ۔ آگرہ۔

یوسف الدین احمد

رئیس شرکت (ڈائرکٹر کمپنی)

اعتذار:۔
پہلے پرچہ میں بہار کی دیوی کی رنگین تصویر شائع کرنے کا انتظام کیا گیا تھا، لیکن عین وقت پر معلوم ہوا کہ کارخانہ تصویر سازی نے جو بلاک تیار کیا ہے نگار کے معیار ادب و صنعت سے مطابقت نہیں کرتا۔ اس لئے افسوس ہے کہ وہ تصویر اس پرچہ میں نہیں دی جاسکی۔

منیجر

نگار

رئیس التحریر: - نیاز فتحپوری

معاون مدیر: - مخمور اکبرآبادی

مجلد ۱	جمادی الثانی سنہ ۱۳۴۰ھ	قیمت سالانہ پانچ روپیہ
شمارہ ۱	فروری سنہ ۱۹۲۲ء	قیمت ایک پرچہ - آٹھ آنہ

فہرست

علم و ادب

باسمہٖ سبحانہٗ

انتساب

اک نازنین رشکِ قمر کشتی میں محوِ خواب ہے
پرتو سے جس کے سطحِ آب اک چادرِ سیماب ہے

کشتی ہے روئے آب پر اور اس میں حسنِ صبح زا
ہے برگِ نیلوفر یہ یا اک قطرۂ شبنم پڑا

کشتی تموج میں ہے یا مضطرب ہے چشمِ نیم وا
کشتی میں ہے وہ برق وش ہو آنکھ میں جیسے حیا

یہ حسنِ سیمیں اور یہ رنگینیِ کیفِ شباب
بت ساز نے بلور کے پیکر میں بھر دی ہے شراب

اک حسن کے پیکر میں یہ مصروفِ راحت ہے شباب
نقشِ جوانی میں ہے یا اک حسنِ کامل محوِ خواب

ابرو میں پورا خم لئے صیادیوں کے واسطے
رخسار میں تجلی لئے صبر و سکوں کے واسطے

آویزہ اس کے کان کا عارض پہ ہے ٹھہرا ہوا
درجِ صدف سے یا کوئی موتی ڈھلک کر رہ گیا

چوٹی ہے یا دو ناگنیں باہم دگر مالوف ہیں
یہ لب ہیں یا دو پنکھڑی اک پھول کی ملفوف ہیں

آنکھیں ہیں بند اس پہ بھی ہے یہ راز ان کا برملا
اندر ہی اندر سحر ہے سانچے میں ان کے ڈھل رہا

اک ہاتھ نیچے سر کے ہے اور دوسرا سینہ پہ ہے
یا دل میں ہے اک جوئے شیر اور ایک آئینہ پہ ہے

گردن ہے شانہ تک کھلی سینہ کمر تک بے حجاب
کیا جانئے منظور ہے قدرت کو اب کیا انقلاب

کشتی جو ساحل سے لگی تو ہو گئی بیدار وہ
اور اس طرح دیکھا مجھے گویا کہ ہے بیزار وہ

کہنے لگی "تو کون ہے کیا اس فضا میں تیرا کام؟"
بولا میں "تجھ سے رکھتا ہے اک گونہ نسبت یہ غلام"

"جلوہ ہے تو میں ہوں نگہ تو برق ہے خرمن ہوں میں"
"تو پھول ہے بلبل ہوں میں گوہر ہے تو دامن ہوں میں"

"تو حسن ہے میں عشق ہوں تو آگ ہے میں ہوں گداز"
"تو بادشہ میں ہوں گدا، تو ناز ہے میں ہوں نیاز"

یہ سن کے وہ ہنسنے لگی اور پھول برسانے لگی
پھر مجھ کو یہ سب دے گئی جب لوٹ کر جانے لگی

ان خندہ ہائے حسن کی کرتا ہوں قائم یادگار
یعنی انھیں پھولوں کا ہے چھوٹا سا گلدستہ نگار

نیاز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

جمادی الثانی ۱۳۴۰ھ فروری ۱۹۲۲ء	نگار	مجلد (۱) شمار (۱)

عناصرِ "نگار"

رسایل وجراید کی سنتِ دیرینہ ہے کہ جب وہ اول اول منصۂ شہود پر آتے ہیں، تو دنیا کے سامنے اپنے مقاصد و اغراض کی ایک طویل فہرست پیش کرتے ہیں، اور یہ ثابت کرنے کیلئے کہ جس دعوے کولیکر وہ رونما ہوئے ہیں اس سے آخر وقت تک منحرف نہ ہوں گے، اپنی تمام لسانی قوت صرف کر دیتے ہیں۔

ہر چند یہ طریقۂ کار فی نفسہ معیوب و مذموم نہیں، لیکن اس وقت تک کے تجربات و نتائج نے، جن کی تلخی سے اُردو داں پبلک کا کوئی فرد ناآشنا نہیں، اس نوع کے آغاز کو ایسی مضحک صورت دیدی ہے کہ مشکل سے اب کوئی سنجیدہ آدمی اِس کی تقلید کی جرأت کرسکتا ہے۔

یہ مسئلہ کہ رسائل کیوں بند ہوجاتے ہیں، گو اک مستقل موضوعِ گفتگو ہے اور اس پر ہمارے ملک کے بعض انشاپرداز تمدنی، سیاسی، مذہبی، اقتصادی نقطۂ نظر سے جدا جدا ایک مضمون سپردِ قلم فرماسکتے ہیں، لیکن نہ میں نے اُن سے درخواست کی کہ اس پر طبع آزمائی فرمائیں اور نہ میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں، البتہ سلسلۂ کلام کی رعایت سے اس قدر ضرور عرض کرنا پڑے گا کہ رسایل کے اسباب ناکامی اکثر و بیشتر خود انھیں کے اندر موجود ہوتے ہیں اور خود انھی کی "تعمیر" میں "خرابی کی صورتیں" مضمر ہوتی ہیں۔

بہرحال، زمانہ کی سرعتِ رفتار اور ان انقلابات کو دیکھتے ہوئے جو زندگی کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ وابستہ ہیں، میں یہ دعوےٰ تو نہیں کرسکتا کہ **نگار** ہمیشہ زندہ رہے گا یا یہ کہ اس کی حیات بہت طویل ثابت ہوگی، تاہم یہ وعدہ ضرور کرتا ہوں کہ جب تک اس رسالہ کی "تحریر" میرے سپرد ہے، اس وقت تک اس کو صرف اس وجہ سے

بند نہ ہونے دوں گا کہ "مضامین فراہم نہیں ہوتے یا لکھنے والے توجہ نہیں کرتے" کہ عام طور سے یہ دقت بھی محسوس کی جاتی ہے۔

اب رہا مادی سوال، سو اس کے متعلق میرا عقیدہ ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ ہندوستان میں بھی جہاں عام طور سے فقدانِ ذوق کی شکایت کی جاتی ہے، ایک ماہوار رسالہ اپنی زندگی قائم رکھنے کے لئے، یقیناً کافی توجہ جلب کر سکتا ہے اگر وہ حقیقتاً اس کا اہل ہے۔ اس لئے اگر انھیں خصوصیات کے ساتھ **نگار** جاری رہا جو میرے یا میرے بعض احباب کے پیش نظر ہیں، تو یہ مشکل بھی آسان ہو جاتی ہے، ورنہ پھر اس کا ناکامیاب رہنا ہی بہتر ہے۔

ہم اے وحشت خرامی اُس کی منزل تک پہونچ جائیں
وگرنہ ہرزہ پیمائی سے تو افتادگی اچھی

علاوہ اس کے دوسرا سبب **نگار** کے استغنا کا یہ بھی ہے کہ وہ کسی فردِ مخصوص کی ملکیت نہیں ہے بلکہ اس کا بار اتنے شانوں پر منقسم ہے کہ اگر ایک خریدار بھی اس کا پیدا نہ ہو تو بھی وہ آسانی سے اس کو ایک طویل زمانہ تک بغیر کسی اضمحلال کے سنبھالے رہ سکتے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ اس وقت، جب کہ سیاسی امیال و عواطف نے، زندگی کے تمام لذیذ و دلچسپ مشاغل کو (شاید بجا طور پر) پس پشت ڈال دیا ہے، اور علی الخصوص اس وقت جب کہ طباعت و کاغذ کی گرانی نقطۂ عروج کی "کلمۂ انگشت" حد تک پہونچ گئی ہے، کسی رسالہ کا (اور رسالہ بھی وہ جو سیاسیات کے شجر ممنوع تک پہونچنے کی جرأت نہیں کر سکتا) جاری کرنا پیش بین اور مصلحت اندیش نگاہوں کے نزدیک کچھ امید افزا بات نہیں ہو سکتی، لیکن اس کا کیا علاج کہ ہم اپنی جس آرزو کو مستقبل کے خوشگوار منظر و حالات سے وابستہ کرتے ہیں، وہ "مستقبل" کے اُسی نقطہ پر پہونچ کر محسوس کرتی ہے کہ "ماضی" اس سے بہتر تھا۔ پھر جب یہ تجربہ تواتر کی حد تک پہونچ جائے اور زمانہ آیندہ کے تمام نقوش پے در پے اسی طرح مبتلائے فریب رکھنے والے ثابت ہوتے رہیں، تو کب تک کوئی انتظار کر سکتا ہے۔ آخر کار مجبور ہو کر اسے کہدینا پڑتا ہے۔

"مرغابی ست و کار با طوفان ست"

اگر کسی عمل میں محرّک کو کوئی امتیازی درجہ دیا جاسکتا ہے، تو مجھے اس جگہ ظاہر کر دینا چاہیئے کہ نگار کے اجرا و اشاعت کا خیال سب سے پہلے جس کے دماغ میں موجزن ہوا وہ میرے نہایت عزیز دوست لطیف اکبر آبادی ہیں کہ اگر آج اُن کی خواہش پوری ہو جائے تو دنیا میں کچھ نظر نہ آئے مگر ادب و موسیقی، رنگ و خوشبو یا پھر ان سب کا مجموعہ عودت۔ میں اس سے زیادہ اِن کا تعارف غیر ضروری خیال کرتا ہوں کیونکہ آپ نگار میں انھیں اکثر دیکھیں گے اور خود ہی فیصلہ کرلیں گے کہ فطرت نے انھیں کیسا پاکیزہ دل و دماغ ودیعت کیا ہے۔

اس کے بعد ہی مجھے ضیا عباس ہاشمی کا ذکر کرنا چاہیئے کہ اگر تحریک کا فخر لطیف کو حاصل ہے تو وہ اس نمایاں امتیاز کے مالک ہیں کہ اس تحریک کو زندہ رکھنے اور کامیابی کی حد تک پہونچا دینے میں صرف انھی کے "نباتاتی" ہات نے کام کیا۔ ضیائی کی سلامت ذوق اور صحت مذاق (جس میں اُن کی "تارک حیوانات" زندگی کو مطلقاً کوئی دخل نہیں ہے) کے متعلق گفتگو کرنا بیکار ہے کہ رسائل کے دیکھنے والے اُن سے آگاہ ہوں گے اور جو نہیں ہیں وہ اب ہو جائیں گے۔

تیسرا وجود حافظ امام الدین اکبر آبادی کا ہے کہ اگر آج مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اُن کی حالت میں جو سکون اور "ٹھیراؤ" نظر آتا ہے، وہ حقیقتاً کاہلی کی وجہ سے نہیں ہے، تو میں ایسے "ہمہ۔ حال۔ مراقب۔ رہنے والے" شخص کے سامنے دست بیعت دراز کرنے کے لئے اسی وقت آمادہ ہوں۔ انھوں نے جس محبت و خلوص، جس لطف اور "پرسکون" آمادگی کے ساتھ اس تحریک میں عملی حصہ لیا، اس کے نقوش میرے دل سے شاید کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ آپ ایک مخصوص رنگ کے انشا پرداز ہیں جس سے پبلک ناواقف نہیں۔

چوتھی ہستی مخمور اکبر آبادی (بی۔ اے) کی ہے کہ اِن سے زیادہ اہل غالباً اُس تخلص کا کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ آپ وہی ہیں جنھوں نے نقاد کے دور آخر میں اپنی رنگین نظموں سے کسی پر یہ بات ثابت نہیں ہونے دی کہ بزم نقاد کا ساقی اب صرف طلوعِ صباح کا انتظار کر رہا ہے۔ آپ نے جس پر شباب جوش کے ساتھ اس تحریک کا خیر مقدم کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ علاوہ اس کے میرے لیے سب سے زیادہ مسرت انگیز بات یہ بھی ہے کہ جناب مخمور میرے معاون ہوں گے، میرے دست راست ہوں گے اور وہ سب کچھ ہوں گے جو ایک انسان دوسرے انسان کے لئے ہو سکتا ہے۔

اب آخر میں آپ مجھ سے یہ سوال کر سکتے ہیں کہ "نگار کے مقاصد کیا ہوں گے"؟ اور میں اس کے جواب میں آیندہ صفحات کی طرف اشارہ کر کے خاموش رہ سکتا ہوں، لیکن قبل اس کے کہ میں یہ جواب پیش کروں میرے لئے اپنے ایک رقیق القلب اور دردمند دل رکھنے والے (Sentimental) دوست کی تقلید میں مختصر سا "لکچر" دینا ضروری ہے۔

یہ حقیقت غالباً کسی سے مخفی نہیں کہ امتداد زمانہ کے ساتھ، جس طرح انسان کی تہذیب و معاشرت تغیر پذیر ہوتی جاتی ہے، اسی طرح اس کے داعیاتِ قلب و دماغ میں بھی انقلاب پیدا ہونا ضروری ہے۔ وہی شخص جو کل صرف قصص و حکایات سے آسودہ ہو جاتا تھا، آج زیادہ کارآمد لٹریچر کا خواہشمند ہو سکتا ہے اور جو آج علم و تاریخ کے متعلق صرف سادہ بیانات پر بس کرنے کے لئے راضی ہے، وہ کل اس کے لئے آمادہ ہو سکتا ہے کہ خود بھی عالمانہ و مورخانہ حیثیت سے کسی واقعہ پر تنقید کرے۔ پھر چونکہ زمانہ پیچھے مڑ کر کبھی نہیں دیکھتا، اس لئے ہم مجبور ہیں کہ اسی کے نشاناتِ قدم پر اپنی شاہراہ عمل بھی قایم کریں، اور اس امید پر ایک جگہ ٹھیر کر نہ رہ جائیں کہ وہ کسی وقت ہمارے حال پر رحم کر کے پھر اسی جگہ واپس آ جائے گا، جہاں سے اس نے ہمارا ساتھ چھوڑا تھا۔

عہد حاضر کی سب سے زیادہ نمایاں خصوصیت اگر کوئی ہو سکتی ہے، تو صرف یہ کہ اس کا مذاق زیادہ وزنی ہوتا جاتا ہے اور تمام وہ قوتیں جو اب سے قبل سطح پر تیرتی ہوئی نظر آتی تھیں، اب عمق کی طرف مائل ہیں، جس کا حال ہمیں بھی اپنے تئیں غرق کر دینے ہی کے بعد معلوم ہو سکتا ہے۔

دنیائے تصنیف و تالیف کو جس میں رسایل و جرائد بھی شامل ہیں، چند حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے "ادب" (جس میں شاعری، موسیقی، افسانے وغیرہ شامل ہیں) "تاریخ" (جس سے مذہب جدا نہیں) "علم" (جو جملہ فنون پر حاوی ہے) اور "سیاست" (جس میں اک "طایر زنداں" سے لیکر "آنریری مجسٹریٹ" تک کے تمام چھوٹے بڑے عناصر و ذرات شامل ہیں)۔

جس وقت ترتیب نگار کے فرائض پر میں نے غور کیا، تو ضروریات زمانہ کو دیکھتے ہوئے یہ فیصلہ تو میں نے پہلی ہی سانس میں کر لیا کہ نگار کو (جس کے نام میں ہر چند ادبی پہلو زیادہ روشن ہے اور میں اُسے لطیف کی رعایت سے بہرحال قایم رکھنے پر مجبور ہوں) خالص ادبی رسالہ تو نہ بننے دوں گا، کیونکہ ادب کی وہ مانگ جو چند سال پیشتر تھی، باقی نہیں رہی ہے اور میں نے بھی (جو اپنی گذشتہ زندگی کی بہت سی چاندنی راتیں اسی موضوع

کی خلوت میں بسر کر چکا ہے) اب اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ جو تفریح تماشا کرنے والوں کی کثرت سے اس درجہ پامال او رعام ہو چکی ہے، اُسے پھر پبلک کے سامنے پیش کروں ۔ اگر یورپ میں آپ سیکڑوں جراید و رسایل صرف قصص و حکایات کے دیکھتے ہیں، تو اسی کے ساتھ اس حقیقت کو بھی نظر انداز نہ کیجئے کہ وہاں مادّی دنیا کے ہنگامہ سے دماغوں کو جس قدر تھکن محسوس ہوتی ہے، اس کے لیے کس قدر اسباب تفریح کی ضرورت ہے، برخلاف اِس کے آپ نے ابھی تک اپنے دماغ کو کسی سنجیدہ مطالعہ سے تھکنے کا موقعہ ہی نہیں دیا پھر "ادب لطیف" کے لیے بیقرار و مضطرب ہونا کیا معنی؟ یورپ کا لٹریچر اپنے اُن فرائض کو ادا کر چکا ہے جو ایک ملک و قوم کے اسباب ترقی کے لحاظ سے اس پر عاید ہوتے ہیں اور اس لیے اب اُس کو حق حاصل ہے کہ وہ ادائے فرائض کے بعد لہو و لعب میں غرق ہو جائے، لیکن ہم نے ابھی تک اُن فرائض کو بھی نہیں پہچانا لطف و سکوں کی جستجو کرنا کیسا !

آخری صورت سیاست کی تھی اور یقیناً یہ موضوع پبلک کو بہت جلد اپنی طرف اپیل کر سکتا ہے، لیکن چونکہ موجودہ انقلاب پسندی کے جذبات سریع کے لحاظ سے ایک ماہوار رسالہ بقدر "لذت کام و دہن" بھی کوئی سامان فراہم نہیں کر سکتا، اس لیے اسے بالکل ترک کر دینا پڑا، کیونکہ میری رائے میں یہی وہ چیز ہے جو رقابت سے سخت بیزار ہے -ہو تو سب کچھ یہی ہو ورنہ بالکل نہ ہو۔

اب رہ گئیں دو تقسیمیں علم و تاریخ کی، سو ان کا اختیار کرنا ضروری تھا۔ کسی قوم و ملک کے مذاق میں خوشگوار تبدیلی اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کی معلومات وسیع ہوں اور اس کا بہترین ذریعہ یہی ہے کہ نہایت حریصانہ طریقہ سے اُردو میں علم و تاریخ کا اتنا اور ایسا مواد فراہم کیا جائے کہ معمولی اُردو داں طبقہ بھی اس سے محروم نہ رہے۔

ظاہر ہے کہ صرف ایک رسالہ یا کوئی ایک مصنّف اِس کمی کو پورا نہیں کر سکتا، لیکن یہ کوئی دلیل اس امر کی نہیں ہے کہ ایک بھی نہ ہو، علی الخصوص اس وقت جب کہ اکثر لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے۔

یہ درست ہے کہ اک علمی و تاریخی رسالہ میں سوائے خشک مضامین کے اور کچھ نہیں ہوتا، لیکن اول تو اس امر کی کوشش کی جائے گی کہ یہ رسالہ اِس حد تک نہ پہنچنے پائے اور اگر موضوع کے لحاظ سے کوئی مضمون ایسا نظر آجائے تو اِس کو دیکھنے کی کوشش کرنی چاہئے کہ اصل مقصود آپ میں اسی ذوق کا پیدا کرنا ہے۔

رسالہ کا ایک حصہ بالالتزام ادبی مضامین کے لئے بھی وقف ہوگا، لیکن اس میں وہ تحقیقی و تنقیدی مضامین بھی شامل ہوں گے جو افسانوں سے علیحدہ ہیں، لیکن ہیں ادب ہی سے وابستہ۔ نظمیں بھی ہوں گی لیکن ایک مخصوص معیار کی، اس لئے اگر آپ کسی مہینہ کے رسالہ کو نظم معرّا کی صنعت میں دیکھیں تو سمجھ لیجئے کہ کوئی نظم (واقعی نظم) موصول نہیں ہوئی۔ اس کمی کو دوسرے ادبی مضامین سے پورا کیا جائے گا۔

معلومات کا ایک حصہ جدا رہے گا جس کے ذریعہ سے کوشش کی جائے گی کہ بہترین اطلاعات (تاریخی و علمی) آپ کی نگاہوں سے گذرتی رہیں۔ فنون لطیفہ کے متعلق بہترین تصاویر بھی شائع ہوتی رہیں گی۔
اتنا عرض کرنے کے بعد غالباً میں تمہید و تقریب کے فرض سے عہدہ برآ ہو جاتا ہوں۔

نیاز

فروغِ نظر

ایک ہی قافیہ میں اسقدر تنوع پیدا کر کے نزاعِ حسن و عشق کی تمام نزاکتوں کو نمایاں کرنا ادب میں ایک ایسا اختراعِ جمیل ہے جو یقیناً دادِ مستغنی ہے (اڈیٹر)

اک روز بصد ناز و ادا حسن یہ بولا
ہاں عشق نے مجھ کو کبھی عریاں نہیں دیکھا

کی عشق نے یوں عرض کہ دعوے یہ غلط ہے
میں نے تجھے کس رنگ میں عریاں نہیں دیکھا؟

جامِ مئے گلرنگ میں، ساقی کی نگہ میں
میخوار نے شاید تجھے عریاں نہیں دیکھا

بلبل نے گل ولالہ میں، اے حسن ادھر دیکھ
کس پردہ میں دیکھا تھا کہ عریاں نہیں دیکھا؟

پروانہ جانباز نے محفل میں سرِ شمع
عریاں تجھے دیکھا تھا کہ عریاں نہیں دیکھا؟

قاتل کے کفِ ناز میں کہ تو سہی مجھ سے
بسمل نے دمِ ذبح بھی عریاں نہیں دیکھا

جرأت ہو تو کہدے کہ سرِ طور یہ مجھ کو
موسیٰ نے بھی بے پردہ و عریاں نہیں دیکھا

سُن کر یہ کہا حسن نے یہ سب سہی لیکن
میں پھر وہی کہتا ہوں کہ عریاں نہیں دیکھا

تسلیم ہے مجھ کو نظرِ عشق کی وسعت
لیکن یہ حقیقت ہے کہ عریاں نہیں دیکھا

واں آنکھ کے پردہ میں تھا، یاں نشہ کے میں
میخوار نے مجھ کو کبھی عریاں نہیں دیکھا؟

میں تھا گل ولالہ میں پسِ پردۂ رنگیں
بلبل نے مجھے باغ میں عریاں نہیں دیکھا

تھا پردۂ فانوس میں پوشیدہ سرِ بزم
پروانہ ہی کہدے گا کہ عریاں نہیں دیکھا

تھی تیغِ برہنہ بھی پسِ پردۂ جوہر
مقتل میں کسی نے مجھے عریاں نہیں دیکھا

تھا خلوتِ ایمن میں بھی مستورِ تجلی
موسیٰ نے مجھے طور پہ عریاں نہیں دیکھا

کچھ سوچ کے پھر عشق یہ بولا کہ سُن اے حسن
مانا کہ کسی نے تجھے عریاں نہیں دیکھا؛

لیکن وہ جو کہ اٹھے، انا لیلیٰ انا الحق
کیا ان کو بھی کہدے گا کہ عریاں نہیں دیکھا؟

سُن کر یہ سخن، حسنِ فسوں ساز یہ بولا
دعوے ہے مرا عشق نے عریاں نہیں دیکھا

یہ لوگ فنا ہو گئے جب ذات میں میری
تب دیکھا ہے، پہلے مجھے عریاں نہیں دیکھا

اس پر یہ کہا عشق نے، اچھا شبِ اسریٰ
کہدے جو کہا جائے کہ عریاں نہیں دیکھا

یہ سُن کے بنا حسن بھی تصویرِ تحیر
جرأت نہ تھی کہنے کی کہ عریاں نہیں دیکھا

ضیائی

(عربوں کے نقطۂ نظر سے)

دنیا کی تمام ان صداقتوں میں سے، جن کا تعلق فطرت انسانی کی فاعل و منفعل کیفیات سے ہے، ایک کھلی ہوئی صداقت شعر بھی ہے اور غالباً یہی وہ حقیقت ہے، جو کبھی ہمیں اس امر کی اجازت نہیں دے سکتی کہ شعر کو فطرت سے منفک کر کے دیکھیں۔ اگر کائنات میں مختلف مناظر کا ظہور، فطرت کے متنوع الالوان مظاہر و آثار کا مشاہدہ ہمارے حواس کو متاثر کرسکتا ہے، تو یہ حقیقت بھی تسلیم کرنی پڑے گی کہ قدرت ہمارے لئے ہر وقت اسباب شعر فراہم کیا کرتی ہے خواہ ہم اس سے فائدہ اُٹھانے کے اہل ہوں یا نہ ہوں۔

دریا کی روانی، آسمان کی لاجوردی فضا، صبح و شام کا طلوع و غروب، رات کی تاریکی، دن کی ضیاپاشی، بہار و خزاں، سردی و گرمی، لذت و الم اور علاوہ اس کے تمام وہ مناظر و کیفیات جنھیں نفس انسانی ادراک کرسکتا ہے وہ برکات ہیں، جن کو فطرت ہر وقت اور ہر حال میں نہایت فیاضی سے ہمارے لئے فراہم کیا کرتی ہے، لیکن ہم میں کم ایسے ہیں جو احساس کے اُس نقطۂ اضطراب تک پہونچ جائیں، جہاں تاثر کی حد ختم ہو کر شاعری شروع ہو جاتی ہے۔

صبح کو کسی سرسبز میدان میں دور تک شبنم کے قطروں کا بکھرا ہوا ہونا، وہ منظر ہے جس سے ہر شخص متاثر ہوتا ہے، لیکن اسی وقت جب کہ بہت سے دیکھنے والے اس پر صرف اک نگاہِ پسندیدگی ڈالتے ہوئے گذر جاتے ہیں، ایک شخص ایسا بھی رونما ہوتا ہے، جو اس حالت سے بے قرار ہو کر وہیں کھڑا ہو جاتا ہے اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل جاتا ہے:-

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
ہے موتیوں سے دامن صحرا بھرا ہوا (انیس)

اگر شعر کا تعلق صرف تاثر سے رہے تو دنیا کے ہر متنفس کو شاعر ہونا چاہئے تھا، کیونکہ تاثر سے کوئی شخص بیگانہ نہیں ہے، لیکن چونکہ حقیقت مفروضہ ایسی نہیں ہے، اس لئے ماننا پڑے گا کہ شاعر ہونے کے لئے علاوہ تاثرات کے کسی اور چیز کی بھی ضرورت ہے اور وہ صرف طبیعت کی موزونی ہے جو تاثرات کو عمدہ اور واضح الفاظ میں

ظاہر کردیتی ہے لیکن چونکہ اس میں بھی عمومیت تھی اور شعر کو زیادہ صنبس گرانمایہ بنانا مقصود تھا، اس لئے اس کے لئے اوزان مخصوص کردے گئے، تاکہ وہ لوگ جو صرف نثر کے ذریعہ سے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہیں، اس گروہ سے جدا ہو جائیں، اور یہی وہ خیال تھا جس کے زیر اثر علماء عرب نے شعر کی یہ تعریف بیان کی کہ "شعر وہ کلام ہے جو متکلم کے قصد سے کسی خاص وزن اور قافیہ پر لکھا گیا ہو"

یہ بالکل صحیح ہے کہ شعر، نفس کا ایک ملکۂ راسخہ ہے، جس کا تعلق کسب و تعلیم سے بہت کم ہے بلکہ وہ ایک فطری ودیعت ہے جسے انسان اپنے دماغ میں لیکر پیدا ہوتا ہے اور حیات انسانی کے مختلف مراحل میں اس کے مظاہر بھی مختلف ہوا کرتے ہیں -

نفس ناطقہ میں تین قوتیں پائی جاتی ہیں :-

۱- قوت عقلی : جس کے ذریعہ سے علوم نظری کا اکتساب ہوتا ہے۔

۲- قوت حسّی : جو حقایق اشیاء معلوم کرکے حکمت عملی (یعنی صنایع وغیرہ) کا درس دیتی ہے -

۳- قوت تاثری : یہ قوت، احساسات کے نتایج کو ایسے کلام کے ذریعہ سے ظاہر کرتی ہے جو اس کے حسیات کو نہایت واضح طور پر ظاہر کر سکے۔ پھر چونکہ ایسی حالت میں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ متکلم کا بیان دوسروں کے دلوں پر اثر پیدا کرکے اُن کی حس میں حرکت کا باعث ہو، اس لئے ضروری ہوا کہ اس کلام میں اک خاص نظم و ترتیب بھی شامل ہو-

چونکہ نطق انسانی سے براہ راست متاثر ہونے والی حس، قوت سامعہ ہے اور تجربہ نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ سامعہ بہ نسبت اور کلام کے شعر سے زیادہ لذت گیر ہوتا ہے، اس لئے ہمارے لئے یہ سمجھنا بہت آسان ہے کہ شعر کی جو خصوصیت سامعہ کو زیادہ متاثر کرتی ہے، وہ اس کی موزونی یا موسیقیت ہے، ورنہ یوں اگر ایک شعر کے الفاظ الگ الگ کرکے سامعہ کے سامنے پیش کئے جائیں تو وہ کبھی متاثر نہ ہوگا-

یہ واقعہ ہے کہ اختلاف ممالک کو ذوق کے اختلاف میں بڑا دخل ہے اور یہی سبب ہے کہ ہر ملک اپنی ہی موسیقی اور شاعری سے زیادہ لطف اٹھاتا ہے۔ ذوق کے مسئلہ میں ماحول کا اثر بھی بہت قوی ہوتا ہے، چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ عربوں پر بہ نسبت دیگر یوروپین اقوام کے یونانی موسیقی زیادہ اثر کرتی ہے (کیونکہ یونانی اُن سے زیادہ قریب ہیں اور قدیم زمانہ میں دونوں کے تعلقات تمدن شدید تھے) اور یہی وجہ ہے کہ ترکی، فارسی، عربی اور یونانی ذوق ایک دوسرے کے قریب ہے -

جب کہ شاعری کا تعلق ذوقِ انسانی سے اس قدر شدید ہے، تو ظاہر ہے کہ وہ طبیعت کے تمام پوشیدہ اسرار کی حامل ہوگی اور یہی سبب ہے کہ ہر قوم کی شاعری اس کے اخلاق، عادات، ادبیات، مادیات اور تاریخی حالات کا آئینہ ہوتی ہے۔ اگرچہ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ شعر کی بنیاد تصوراتِ خیالی، استعارات، کنایات اور تشبیہات وغیرہ پر قائم ہے، لیکن پھر بھی اِن لطیف پردوں کے پیچھے ایک حقیقت واقعہ موجود ہے، جس کی جھلک نمایاں طور سے نظر آتی ہے۔ ایک فلسفی کہتا ہے کہ "شعر انساں کے عمیق ترین اسرار کی ظاہری صورت ہے۔ مناظرِ فطرت کا حسن، تخیل کی نزاکت، نغمات کی لطافت، سب شعر ہی کے واسطہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ نثر کا تعلق صرف تصور سے ہے، لیکن شعر، تصور و احساس دونوں سے تعلق رکھتا ہے۔ چونکہ شاعر کا ذہن عالمِ احساس و عالمِ تصور دونوں کی سیر کرتا ہے، اس لئے وہ ہر شے کا وصف اسی وقت کرتا ہے جب اس کے تمام ذاتی و عارضی خصوصیات پر احاطۂ تام کرلے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض قومیں شاعر کو موجد و مبدع کا لقب دیتی ہیں، کیونکہ وہ ہر چیز کے وصف، اس کے لوازم و متعلقات کا انتہائی استقصار کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ ہر چیز کے پوشیدہ اسرار ظاہر کرنے کا موجد ہے۔"

اس میں شک نہیں کہ علم بھی رموزِ فطرت کے چہرہ سے نقاب اُٹھا دیتا ہے، لیکن فرق یہ ہے کہ نتائج علمیہ کثرتِ امتحان و تجربہ سے حاصل ہوتے ہیں اور مقدماتِ شعری کا انحصار صرف صحتِ تصور و سلامتِ تخیل پر ہے۔ پھر چونکہ علمی نقطۂ نظر سے نتائج استقصار (Inductive Conclusions) بدلتے رہتے ہیں، اس لئے علم کے قضایا مسلّمہ بالکل ضعیف ہیں اور اُن کی بنیاد نہایت کمزور ہے۔ برخلاف اس کے شعر ایک ایسی مستحکم صداقت ہے جس پر امتدادِ زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہومر نے اپنی شاعری میں جن قدیم علوم و فنون کا ذکر کیا ہے وہ آج قریب قریب معدوم ہوگئے ہیں، لیکن اس کی شاعری اب تک اسی لطافت و پاکیزگی کے ساتھ زندہ ہے۔

یہ صحیح ہے کہ جب علم اپنی تحقیقات کے ذریعہ سے ایک بعید مسافت طے کر لیتا ہے، تو شاعر اُس کی غایت تک نہیں پہونچتا، لیکن یہ بھی یقینی ہے کہ شعر جس جگہ ٹھیر کر اپنے اکتشافات کو پیش کرتا ہے وہ علم کی دسترس سے بالکل باہر ہے۔ ایک قوم کے اخلاق و عادات کا جس قدر صحیح اندازہ اس کی شاعری سے ہوسکتا ہے، کسی اور ذریعہ سے ممکن نہیں۔ ہندوؤں کی قدیم شاعری کو دیکھئے۔ کیا آپ اس سے اُن کے فلسفی تصورات

کے عمق کا پتہ نہیں چلا سکتے، اور کیا اُن کی قدیم تاریخ اس مسئلہ پر کچھ روشنی ڈال سکتی ہے؟ ہرگز نہیں۔ اسی طرح عربی شاعری کو آپ دیکھیں گے تو بیک نظر آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ تاریخ عرب پر دو دور گزر چکے ہیں جن میں سے ایک کو دور جاہلیت اور دوسرے کو دور اسلام کہتے ہیں۔ یونانی شاعری میں جو سلاست و روانی، جوسرت و شگفتگی پائی جاتی ہے وہ صاف طور سے بتا رہی ہے کہ ان کا مذہب سوائے حسن پرستی کے اور کچھ نہ تھا۔ الغرض سمجھو اسی طرح تمام ممالک کی شاعری سے وہاں کے تمدنی و مذہبی تغیرات کا حال معلوم ہوتا ہے اور صرف شعر ہی بتا سکتا ہے کہ :—

۱۔ جب یونان کی شاعری روما میں منتقل ہوئی تو اس کی متانت و سنجیدگی غرور و تکبر کی حد تک کیوں بڑھ گئی ؟

۲۔ عبرانی شاعری کیوں صرف دینی خیالات، مذہبی عقاید، زہد و اتقار کے جذبات کا مجموعہ تھی ؟

۳۔ یورپ میں جب نصرانیت شروع ہوئی تو کیوں وہاں عبرانی شاعری کی تقلید کی گئی اور پھر قرون متوسطہ کے بعد کس طرح جذبات نگاری و افسانہ نویسی کا رواج وہاں قائم ہوا ؟

۴۔ اسپین کی شاعری میں مضحکات کیوں زیادہ نظر آتے ہیں اور انگریزی شاعری کیوں سنجیدہ ہے ؟

۵۔ فرانس کی شاعری نے کیونکر ہزلیات سے منتقل ہو کر حکیمانہ رنگ اختیار کیا ؟

۶۔ جرمنی شاعری میں عالمانہ رنگ کیونکر پیدا ہوا ؟

۷۔ یہ کیا بات ہے کہ انگلستان کی شاعری وصفی، دینی، فلسفی ہے۔ فرانس کی تشکیکی و مادی اور جرمنی کی حلولی ہے۔

(۲)

چونکہ اُردو شاعری، ایران کے دورِ آخر کی شاعری سے ماخوذ ہے اور ایران کی یہ شاعری بہت کچھ عربی شاعری کا پرتو تھی، اس لئے ہم ذرا تفصیل کے ساتھ عربوں کے فن شعر سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔ ابن خلدون صنعت شعر کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ "شعر کا طریقہ نثر سے بالکل علیٰحدہ ہے اور اس کا معیار نہایت بلند۔ کلام شعری میں مساوی الوزن چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہوتے ہیں اور ہر ٹکڑے کا آخری حرف ایک ہوتا ہے، جسے حرف روی کہتے ہیں۔ پورا کلام قصیدہ کہلاتا ہے اور اس کے ہر بیت میں اک مستقل مضمون ہوتا ہے جو اپنے

ماقبل اور مابعد شعر سے مربوط ہوتا ہے۔ پورا قصیدہ ایک ہی وزن پر لکھا جاتا ہے تاکہ طبیعت تساہل کر کے ایک بحر سے دوسری بحر میں نہ جا پہونچے۔ اوزانِ شعر کے لئے خاص خاص شرائط و احکام ہیں جو علم عروض میں تفصیل کے ساتھ بیان کئے گئے ہیں۔" اس کے بعد ابن خلدون لکھتا ہے کہ "چونکہ عربوں کے اشعار علوم و اخبار کا مجموعہ تھے اور واقعات کی صحت و عدم صحت پر اُن کی شہادت پیش کی جاتی تھی، اس لئے ان کا درجہ بہت بلند تھا۔"

یقیناً ملکۂ شعر گوئی عربی طبایع میں کثرت سے راسخ تھا، لیکن اس کا ہر طبیعت میں اپنے تمام لوازم کے ساتھ پایا جانا ضروری نہ تھا اس لئے جو لوگ اس ملکہ کو اپنی علمی قوت کے ذریعہ سے حاصل کرنا چاہتے تھے، انھیں سخت مشکلات کا سامنا ہوتا تھا اور پہلے مشہور شعراء عرب کا کلام دیکھنا پڑتا تھا کہ شاعری کی وہ خصوصیات جنھیں علم بیان و معانی یا علم عروض نہیں بتا سکتا پوری طرح مستحضر ہو جائیں۔ اسی لئے زمانۂ مابعد میں عہد اسلام کے مشہور شعراء ذی الرمہ، جریر، ابو نواس، بحتری، ابو تمام وغیرہ کے کلام پر عبور ضروری قرار دیا گیا۔

۷ ابن رشیق نے العمدہ میں لکھا ہے کہ "شعر نظم کرنے سے پہلے قافیہ کا انتخاب ضروری ہے، کیونکہ نظم کرنے کے بعد مناسب قافیہ کا انضمام بہت دشوار ہو جاتا ہے۔ شعر کہنے کے بعد اُسے بنظر اصلاح متعدد بار پڑھنا چاہئے اور رہر مرتبہ فصیح تر الفاظ کی جستجو کرنی چاہئے۔ ضرورت شعری کی وجہ سے زائد الفاظ اور تعقید کا لانا معیوب ہے۔ شعر کی خوبی یہ ہے کہ اس میں صرف ایک معنی کا احتمال ہو۔ سوقیانہ اور مبتذل الفاظ شعر کو درجۂ بلاغت سے گرا دیتے ہیں۔" یہی وہ خیال تھا جس کے زیر اثر ابن خلدون کو کہنا پڑا کہ "جسے ابو تمام، ابن معتز، ابن ہانی، شریف رضی، ابن زیات وغیرہ کے اشعار یاد ہوں، اس کا ملکۂ شعری نہایت بلند ہو سکتا ہے، برخلاف اس کے ابن سہل، ابن نبیہ، عماد اصفہانی وغیرہ متاخرین کا کلام مفید نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ اس قدر بلیغ نہیں ہے۔"

عہد اسلام کے شعراء کو بلحاظ بلاغت شعراء جاہلیت سے اسی لئے فائق سمجھا جاتا ہے کہ انھوں نے قرآن کی بلاغت اور اسلوب لطافت سے فائدہ اُٹھایا تھا اور یہی وہ بات ہے جس نے حسانؓ، جریر، فرزدق، ذی الرمہ، احوص اور بشار کو امرؤ القیس، نابغہ، عنترہ، ابن کلثوم اور زہیر وغیرہ سے ممتاز کر دیا ہے۔

بلاغتِ شعری اور فصاحتِ کلام کا تعلق زمان و مکان سے بہت ہے، اور یہی سبب ہے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کا ذوق مختلف ہوا کرتا ہے۔ چنانچہ امرء القیس کا یہ قول :-

قفا نبكِ من ذكرى حبيب ومنزل
بسقط اللوى بين الدخول فحومل
فتوضح فالمقراة لم يعف رسمها
لما نسجتها من جنوب و شمال

اے میرے دونوں دوستو، اُٹھو تاکہ محبوب اور اُس کی منزل کی یاد کرکے روئیں، جو دخول، حومل، توضح اور مقراۃ کے درمیان مقام سقط اللوی میں واقع ہے اور جس کے آثار ابتک شمالی وجنوبی ہواؤں کے چلنے سے محو نہیں ہوئے۔

اس کے دوستوں کے نزدیک عرب کے صحراؤں میں، جہاں سراب، ریت، اونٹ، خیموں، پرانے بدوی قیام گاہ کے آثار اور سنگلاخ زمینوں کے سوا کچھ نہیں ہے، زیادہ فصیح نظر آئے گا، لیکن امرؤالقیس کے کئی صدی بعد جب عربی تمدن عروج پر تھا متنبی کا یہ انداز بیان کچھ اچھا نظر نہ آئے گا :-

خرجوا به ولكل باك خلفه
صعقات موسىٰ حين دك الطور
والشمس في كبد السماء مريضة
والارض راجفة تكاد تمور
وحفيف اجنحة الملائك حوله
وعيون اهل اللاذقية صور

اس کے جنازہ کو اس حال میں لیکر نکلے کہ ہر رونے والے پر اس کے پیچھے موسیٰ کی طرح، جب کوہ طور تجلی سے ریزہ ریزہ ہو گیا تھا، بیہوشیاں طاری تھیں۔ آفتاب وسط آسمان میں مریض نظر آتا تھا اور زمین، قریب تھا کہ غایت اضطراب سے جنبش کرنے لگے۔ رحمت کے فرشتوں کی آواز پرواز ان کے گرد تھی اور لاذقیہ والوں کی آنکھیں اس دلگداز منظر کو دیکھنے کی طرف مایل تھیں۔

امرء القیس عربی صحرا میں رہ کر بدوی زندگی کا خوگر ہو گیا تھا، اس لئے وہ اس قسم کے مناظر تمدن کا نقشہ کیونکر پیش کر سکتا تھا۔

اسی طرح ایک رند بادہ خوار ابو نواس کے اس قول کو زیادہ پسند کرے گا :-

ومستطيل على الصهباء باكرها
في فتية باصطباح الراح حذاق

بہت سے صبوحی نوش جو دوسرے جوانانِ صبوحی نوش کے ساتھ شراب پینے کے عادی ہیں، وہ جس چیز کو دیکھتے ہیں

فکل شئ راٰہ ظنہ قدحا وکل شخص راٰہ ظنہ الساقی	اُسے ساغر سمجھنے لگتے ہیں اور جو شخص انھیں نظر آتا ہے، اُسے ساقی ہی یقین کر لیتے ہیں۔

لیکن اسے عنترہ کا یہ قول پسند نہ ہو گا جس میں لطافت مضمون کے ساتھ حماست کا پہلو بھی موجود ہے

ولقد ذکرتک والرماح نواھل منی وبیض الھند تقطر من دمی	میں نے تجھ کو ایسے حال میں یاد کیا جب کہ نیزے میرے خون سے سیراب ہو رہے تھے اور ہندی تلواروں سے میرا خون ٹپک رہا تھا۔
فوددت تقبیل السیوف لانھا لمعت کبارق ثغرک المتبسم	میں نے اس وقت تلواروں کو چومنا چاہا، کیونکہ وہ بھی تیرے ہی متبسم دانتوں کی طرح چمک رہی تھیں۔

شعر کا مدار تمام تر محسوسات و منقولات پر ہے۔ چونکہ عرب جاہلیت کے محسوسات نہایت سادہ اور منقولات صرف افسانہائے عشق و حرب تھے، اس لئے ان کی زبان میں خشونت تھی اور ان کی ادبیات میں وہ لطافت معنوی اور حکیمانہ اسلوب نہیں تھا، جو دولت اموِیہ، عباسیہ اور اندلسیہ کے عہد تمدن کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ عرب شاعری کے عروج کا افسانہ نہایت دلچسپ ہے، اور اس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد میں جب کہ یورپ بالکل غیر متمدن و وحشی تھا اور ادبیات سے اس کو مطلقاً مس نہیں تھا، عربوں کی وسعتِ شاعری کا کیا عالم تھا اور کس کس رنگ میں کیسے کیسے شاعر موجود تھے۔ ابن ابی الاحوص نے شعر کی اٹھارہ قسمیں کی ہیں:۔ غزل، وصف، فخر، مدح، ہجو، عتاب، اعتذار، ادب، زہد، خمریات، مرثیہ، بشارت، تہنیت، وعید، تحذیر، ملح، سوال، جواب۔ بعض نے اس میں زہریات، حکمت، مذاق، فراق، شوق اور حماست کا بھی اضافہ کیا ہے۔

عرب میں یہ بھی رواج تھا کہ ہر شاعر ایک مخصوص رنگ کو اختیار کر لیتا تھا اور اسی میں وہ شہرت حاصل کرتا تھا، چنانچہ زہیر کی حولیات، نابغہ کے اعتذارات، عنترہ کے حماسیات، کمیت کے ہاشمیات، ابو نواس کے خمریات، ابن معتز کی تشبیہات، ابو العتاہیہ کی زہدیات، بحتری کی مدحیات، ابو تمام کے مرثیئے، کشاجم کے لطایف، صنوبری کے روضیات، متنبی کی حکمیات اور ابن فارض کی غزلیات آج بھی مشہور ہیں۔

روسائے عرب کو شاعر بننے کا بڑا شوق تھا، وہ سوق عکاظ میں لوگوں کو اپنے اشعار سناتے،

ماہرین فن سے اصلاح لیتے اور جو کلام فصیح و بلیغ ہوتا اُسے کعبہ کے دروازہ پر آویزاں کردیتے۔ عربی طبایع پر شاعری کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ اپنے تاریخی حالات، اپنے اخلاق و عادات، اپنی قومی خصوصیات، اپنے فضایل و مفاخر سب اشعار ہی کے ذریعہ سے ظاہر کرتے تھے اور رفتہ رفتہ وہاں شاعری نے اپنا اثر اس قدر قایم کرلیا کہ قبایل کی حالت کو بلند و پست بنانا، آتش جنگ مشتعل کردینا، امن و صلح قایم کرادینا، حقیر کو معزز اور معزز کو حقیر بنادینا سب کچھ شاعری کی قلمرو میں داخل ہوگیا۔ عرب کے ایک قبیلہ کا نام انف الناقہ (ناقہ کی ناک) تھا اور لوگ تحقیر کے ساتھ اس کا نام لیا کرتے تھے، لیکن جب حطیہ شاعر نے اسی قبیلہ کی تعریف میں یہ شعر کہہ دیا کہ:-

قوم ھم الانف والاذناب غیرھم ومن یسوی بانف الناقۃ الذنبا

تو یہی نام اک نشانِ عزت بن گیا۔ اس قسم کے واقعات سے عربی شاعری کی تاریخ بھری پڑی ہے۔

صدر اسلام میں شاعری کی طرف توجہ کم ہوئی، کیونکہ ایک طرف امور دین، مسئلۂ نبوت و وحی نے لوگوں کی توجہ اپنی طرف جلب کرلی اور دوسرے نظم قرآن نے شعرا کو متحیر بنادیا۔ لیکن جب ابتدار اسلام کے تمام مراحل طے ہوگئے تو رفتہ رفتہ پھر لوگوں کو شعر کی طرف توجہ ہوئی یہانتک کہ عہد بنی عباس میں تو اس کے عروج کی کوئی انتہا نہ رہی، کیونکہ خلفار وقت خود بے بدل شاعر تھے اور اُن کے نقاد فن ہونے کی وجہ سے بہترین لٹریچر عربی زبان میں فراہم ہو رہا تھا۔

(۳)

شعر کی تاریخ نہایت قدیم ہے، حتےٰ کہ اس کی ابتدار تاریخ الالسنہ کے ساتھ ہی ساتھ ہوتی ہے۔

علم الآثار سے معلوم ہوتا ہے کہ نثر کی تاریخ سے شعر کی تاریخ پہلے شروع ہوتی ہے، چنانچہ ہندوستان، ایران اور یونان کے آثار اس کے ثبوت میں پیش کئے جاسکتے ہیں۔

عربی شاعری کے متعلق اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ سب سے پہلے عاد نے شعر کہے، بعض ثمود کو بتاتے ہیں اور بعض حمیر اور مضر بن نزار کو۔ بہر حال عرب میں کسی نے بھی شاعری کی ابتدار کی ہو، یہ یقینی ہے کہ اس کی ترقی تدریجی تھی جو صحرا کی وسعت میں شروع ہوئی اور وہیں انتہا کو پہونچی۔

عرب اپنے خیموں میں جمع ہوتے، بزم مشاعرہ قایم ہوتی، لوگ اشعار سنتے اور دوسروں کو سناتے یہانتک

کہ ایک شاعر کا کلام ہر زبان پر ہوتا اور غیر شاعر جماعت اپنے کلام کی تائید میں اس کو بطور نظیر و تمثیل کے پیش کرتی۔

عربوں میں ایک سالانہ جلسۂ ادب سوق عکاظ میں ہوتا تھا جو نخلہ اور طایف کے درمیان واقع تھا، یہاں شعراء عام جلسہ میں اپنے اشعار سناتے، شاگردوں کے کلام میں اصلاح دیتے اور اس ادبی جولانگاہ کی رونق ایک ماہ تک قایم رہتی۔ شوال کے آخر میں یہ ادبی اجتماع ختم ہوتا اور یہیں سے لوگ حج کے لئے روانہ ہوجاتے۔

یورپ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہاں سب سے پہلے ایک یونانی شخص نے شعر کہے جس کا نام ہیسودوروس تھا اور ۱۰۰۰ ق۔م میں پایا جاتا تھا۔ اس کے چالیس سال بعد ہومر پیدا ہوا جو یونان کا نہایت زبردست شاعر تسلیم کیا جاتا ہے۔ ہومر کے عہد میں شاعری کا موضوع جذبات دینی، حماست و شجاعت، قوموں کے حالات اور عشق و محبت کے افسانوں پر مشتمل تھا۔ ساتویں صدی قبل مسیح میں یونان نے ایک اور شاعر پیدا کیا جسے ڈراما نویسی کا موجد کہا جاتا ہے۔ پہلی صدی قبل مسیح میں سرزمین یونان پر ایک اور شاعر رونما ہوا جس کا نام الیسیودس تھا۔ یہی پہلا یونانی شاعر ہے جس نے فن زراعت کے متعلق نظمیں لکھیں۔ اِس کے بعد یونان میں شاعری کا رواج زیادہ وسیع ہوگیا اور اہل روما نے اِن سے فن شعر کو حاصل کرکے اس میں بہت کچھ ترقی کی۔

اہل روما میں سب سے پہلا شاعر فرجیلیوس تھا۔ اس نے ۱۹ء میں وفات پائی۔ اس کے بعد استاسیوس نے ظریفانہ رنگ کے قصائد لکھے، جو ملک میں بہت مشہور رہے۔ جب مسیحی مذہب یوروپ میں عام ہوا، تو اسی کے ساتھ شاعری نے بھی بہت ترقی کی۔ اس عہد کا آخری بت پرست شاعر کلودیانوس تھا جو انجیل کا مقابلہ کرنے کے لئے اسکندریہ سے روما گیا تھا۔

جب سلطنت روما کا انقراض ہوکر مشرق و مغرب میں دو حکومتیں جداگانہ قایم ہوئیں اور اقوام بربرہ نے مغربی حصہ پر قبضہ کرلیا تو دیگر علوم و فنون کے انحطاط کے ساتھ شاعری بھی رخصت ہوگئی۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں ایک شاعر غریغوریوس پیدا ہوا، جس نے اصول مذہب پر لاطینی زبان میں نہایت نفیس اشعار لکھے۔ اِس کے بعد نونوس مصری کنتوس ازمیری پیدا ہوا۔ اس نے ہومر کی مشہور تصنیف الیڈ کو پورا کیا اور شہر صور کی فتح تک کے حالات اس میں اضافہ کردئے۔

جب قیصر یوستیانوس کا عہد شروع ہوا تو ایک مورخ جس کا نام اغنیاس تھا ظاہر ہوا۔ اس کو قدیم اشعار یاد کرنے کا بڑا شوق تھا، چنانچہ اسنے ایک مجموعہ اپنے منتخب اشعار کا مرتب کیا اور اس کا نام دایرہ رکھا۔ اس میں تاریخی حالات، مرثیے، ہجو، غزل، حکمت وغیرہ سبھی کچھ تھا۔ اس مجموعہ کو کیفلاس اور بلندوس نے لیا اور خود بھی اسی طرز پر اشعار کہے۔ ان دونوں شاعروں کا مجموعۂ کلام اس وقت تک یوروپ کے پاس محفوظ ہے۔

حروب صلیبیہ کے بعد جب یوروپ نے علوم اور فلسفہ کی طرف توجہ کی تو فلسفہ سے پہلے شعر میں کمال پیدا کیا اور شاعری کا انداز قریب قریب وہی رکھا جو ہومر اور اسیوس کا تھا۔ اس عہد میں یوروپین شاعری کو بڑی ترقی ہوئی، امراء و سلاطین نے اس طرف توجہ کی اور فرانس، اسپین، آسٹریا وغیرہ میں عربوں کے سوق عکاظ کی طرح مجالس ادب قائم ہونی شروع ہوگئیں۔ اطالیہ بھی اس مسئلہ میں کسی سے کم نہیں رہا اور سولھویں صدی میں اریوسطو اور تاسو (دو مشہور شاعروں) نے سب سے پہلے اطالیہ کی موجودہ زبان میں شاعری کی ابتدا کی۔

اسپین میں شعر کا کافی رواج ہوا۔ یہاں لڑائیوں کے حالات، عجائبات سحر، اصول انشاء، قدیم تاریخی واقعات زیادہ نظم کئے جاتے تھے۔ لوپیں، فیف اور کالدرون مشہور شاعر گذرے ہیں، انھوں نے تھیٹر کے لئے بھی بہترین اشعار تصنیف کئے تھے۔

ڈنمارک کے کسان بھی جاڑوں کی راتوں میں جب اون دھنکتے تھے تو اشعار پڑھا کرتے تھے۔

روس میں ایک خاص جماعت تھی جو سوتے وقت امراء کے سرہانے بیٹھ کر اشعار سنایا کرتی تھی۔ جب پیٹر اعظم نے تھیٹر قایم کیا تو ملکہ نتالیا نے تھیٹر کے لئے منظوم افسانے لکھے جو تالیفات شیکسپیر سے زیادہ مشابہ ہیں۔

انگلستان میں شیکسپیر کو جو شہرت نصیب ہوئی وہ کسی سے مخفی نہیں۔ یہ پندرھویں صدی میں پیدا ہوا تھا۔ سترھویں صدی میں ایک اور مشہور شاعر پوپ پیدا ہوا اسنے الیڈ کو انگریزی میں منظوم کیا، جو آج بھی عام طور سے نظر آتی ہے۔ فرانس میں پندرھویں صدی کے اندر ایک شاعر اوکتافیاں بہت مشہور ہوا، جس نے ہومر کے دو قصیدوں کا ترجمہ نظم میں کیا۔ اس کے علاوہ دیلوں نے بھی بہت شہرت حاصل کی۔ اسی نے سب سے پہلے قدیم حکایات کو فرانسیسی زبان میں

منتقل کیا، لیکن فرانس کے مشہور شعرا، کی فہرست سترھویں صدی کے بعد شروع ہوتی ہے۔

یورپ کے فنون شعری عرب کی شاعری سے مختلف ہیں۔ لیکن اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ فن کے لحاظ سے جس قدر عرب کی شاعری مکمل ہے، اس قدر یوروپ کی شاعری نہیں ہے۔

نیاز

افکار ہادی

(نتیجۂ فکر جناب سید محمد ہادی صاحب بی اے۔ ایل ایل بی، وکیل)

پہلو میں درد، دل میں عجب اضطراب ہے
اس بے وفا کا شوقِ ستم کامیاب ہے

ہوتا کبھی نصیب نہ یہ حسنِ جاوداں
باغِ جناں میں آپ کا رنگِ شباب ہے

رسوائیاں نہیں ہیں مرے اضطراب میں
قائم سکونِ دل سے تمہارا حجاب ہے

اب دیکھیے، تلاطمِ جذبات کیا کرے
میرا وجودِ ہستی نقشِ بر آب ہے

آتی نہیں نظر کوئی صورت مراد کی
دنیائے آرزو کی بھی مٹی خراب ہے

موجودہ ضبط پر مجھے کیا اعتماد ہو
ہر جنبشِ نظر تری اک انقلاب ہے

ہوتا ہے میرا جوشِ نہاں اور مشتعل
تیری خطائے ناز میں رنگِ صواب ہے

گھبرا رہا ہوں، خامشیٔ شوق دیکھ کر
میرے سکون دل میں بھی اک اضطراب ہے

بیداریاں ہیں خفتہ نصیبوں کے بخت میں
ناکامیوں میں جوشِ تمنا کا خواب ہے

کھل جائے تیری آنکھ جو ہو جائے آنکھ بند
ہادی ترا وجود، ہم آغوشِ خواب ہے

کلامِ فانی

(از: مولوی شوکت علی خاں فانی، بی۔اے، ایل ایل بی۔ علیگ)

حضرتِ فانی دورِ حاضر کے اُن چند نفوس میں سے ہیں جنھیں اُردو شاعری کا نفسِ ناطقہ کہہ سکتے ہیں۔ آپ جس وقت وسیع مضامین کو مختصر الفاظ میں سمیٹ کر لے آتے ہیں، تو استعارہ بالکنایہ کی ایسی عجیب و غریب مثال پیش نظر ہو جاتی ہے کہ جناب فانی کے صحتِ ذوق پر ایمان لے آنا پڑتا ہے۔

آپ کا رنگِ تغزل افسانۂ گل و بلبل یا سطحی جذبات سے بالکل علیحدہ ہے۔ آپ کی غزل "وارداتِ قلب" کی روداد ہے اور آپ کا اندازِ بیان "سحرِ حلال" کی روشن مثال۔

مانا حجابِ دید مری بیخودی ہوئی
تم وجہِ بیخودی نہیں، یہ ایک ہی ہوئی

دل ہے وطاق، غمکدۂ عمرِ دوش کا
رکھی ہے جس پہ شمع تمنا بجھی ہوئی

میں منزلِ فنا کا نشانِ شکستہ ہوں
تصویرِ گردِ بادِ وفا ہوں مٹی ہوئی

تعمیرِ دل نے تجھ سے لیا انتقامِ عشق
تیری ہی بزم جلوہ گہِ عاشقی ہوئی

آتی ہے گی خبر، اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

مرحوم کس ادا سے تماشائیوں میں تھا
پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

دنیائے دل میں، یاس کی اللہ ری دارو گیر
جو آرزو کہ خلق ہوئی کشتنی ہوئی

کیجئے دعا کہ اُف تو کرے دردمندِ عشق
اول تو دل کی چوٹ پھر اتنی دُکھی ہوئی!

میرا وجود کفر، مری زندگی گناہ
ہستی کو ہوش، ہوش کو لازم خودی ہوئی

یارب، نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

لازم ہے احتیاط، ندامت نہیں ضرور
لے، اب چھری تو پھینک لہو سے بھری ہوئی

فانی وہ میں ہوں نقطۂ موہوم اتصال
جس میں عدم کی دونوں حدیں ہوں ملی ہوئی

سمنستان کی شاہزادی

(۱)

"اُس وقت سے کہ کرۂ ارض نے رقصِ خورشیدی کا مطالعہ شروع کیا، تمام عالم میں شاہزادی سمنبر سے زیادہ حسین اور لطیف بچہ پیدا نہیں ہوا۔" دربارِ شاہی کا مورخ جو واقعات کے انضباط میں بہت زیادہ محتاط واقع ہوا تھا جس وقت حکومتِ سمنستان کی تاریخ قلمبند کرنے لگا تو بے ساختہ یہ فقرہ اُس کے قلم سے نکل گیا۔

شاہزادی سمنبر نے، اس ساعت میں جب گلاب اپنی پنکھریاں کھول دیتا ہے، اُس لمحہ میں جب کلیاں یک جرعۂ صبا کے عوض میں اپنا جامۂ احرام اُتار ڈالتی ہیں، اور ٹھیک اُس وقت جب ستارے اس محشرِ رنگ و نور کا تماشا دیکھکر آخری شعاعِ نظر دنیا پر ڈالتے ہوئے اپنی آنکھیں بند کر لیتے ہیں، اس عالم میں قدم رکھا۔

شاہی مورخ نے بھی اسے ایک نظر دیکھا تھا جب دایہ شاہزادی کو اپنی آغوش میں لئے ہوئے جھروکے میں اس لئے لائی تھی کہ اس بارہ ماہ کے نظارے سے رعایا کے ہجوم کی شادمانی مکمل ہو جائے۔ مورخ اس کے بعد سیدھا اپنے مکان پر پہونچا کہ اپنے فرائض میں مصروف ہو۔ چنانچہ چاشت سے قبل اُس نے اپنے موضوع پر جس کا عنوان "شاہزادی سمنبر" تھا تین ابتدائی باب مکمل کر لئے اور تمہیدی ابواب میں اُس نے اپنے قلم کا پورا زور صرف کر کے نہایت شاندار و حسین الفاظ میں شاہزادی سمنبر کے واقعات پیدائش منضبط کئے۔ اِن صفحات کے لکھنے میں وہ ایک مورخ کی حیثیت سے بڑھکر ایک شاعر کا درجہ رکھتا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنے میں اُسے کوئی الزام بھی نہیں دیا جا سکتا۔

سمنستان میں ہفت روزہ جشن برپا تھا، سات روز تک وقت کا شمار معطل ہو گیا تھا اور کسی کو خبر نہ تھی کہ طلوع و غروب کا مفہوم کیا ہے اور اُن سے کون کون سے فرائض انسانی علیحدہ علیحدہ متعلق ہیں، وہاں کے باشندوں کو ان محبوب ترین ایامِ جشن و مسرت میں کوئی کام نہ تھا، سوائے اس کے کہ ہر خیال میں آسکنے والا طریق طرب اندوزی و طرزِ عشرت افروزی کام میں لائیں اور سرور و انبساط میں غرق ہو کر رہ جائیں، لیکن وزیر تشریفات ضرور مصروف تھا کہ تمام انتظامات جشن اسی کے سپرد تھے ۔ دربار شاہی

کا مورخ یقیناً منہمک تھا کہ اب اُسے اپنی تاریخ سے زیادہ دلچسپی ہو گئی تھی، کنیزیں بے شک مشغول تھیں کہ ان میں سے ہر ایک حسین شاہزادی کو اپنی گود میں لینے کے لئے بیقرار نظر آتی تھی اور گلزارِ شاہی کا باغبان بھی حقیقتاً بہت عدیم الفرصت تھا جسے ہر ہر گھنٹے کے بعد تازہ گلاب کی پنکھڑیاں تمام راستوں میں بچھا دینا پڑتی تھیں۔ سارا شہر، تمام ملک، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا وہاں کے باشندے کبھی کوئی کام کرتے ہی نہیں مگر عیش و طرب کے جلسے اور لطف و مسرت کی تلاش۔

"ہمیں یاد رکھنا چاہیئے" سمنستان کے باشندوں کا مقولہ تھا "کہ یہ عیش و مسرت کے دن ہیں اور ایسے مواقع ہمیشہ حاصل نہیں ہو سکتے" یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ تمام ملک سمنستان میں کوئی متنفس کام دھندا کرتا تھا اور وہاں کے باشندے صفحۂ عالم پر سب سے زیادہ مسرور سب سے زیادہ عشرت پرست تھے۔ وہ صرف سیر و تماشا میں محو ہو جانے کو ہی مقصودِ زندگی سمجھتے تھے اور کچھ نہ کرنا ہی ان کا کام تھا۔ ان کا اگر کوئی مشغلہ تھا تو صرف یہ کہ باغوں میں جا کر (اور سمنستان کا ہر ہر چپہ باغ تھا) رقص کرتے اور جب خستہ و مضمحل ہو جاتے تو گلاب کی بچھی ہوئی پنکھڑیوں پر گر پڑتے، اپنی گودوں کو اُن سے بھرتے اور پھر تازہ دم ہو کر محو رقص ہو جاتے اِن کا مدارِ حیات صرف خوبانیاں، تھیں کیونکہ سمنستان میں پھولوں اور خوبانیوں کے سوا کوئی چیز پیدا نہ ہوتی تھی اور یہ نتیجہ تھا وہاں کے موسم کا۔ اس موسم کو سدا بہار کہا جا سکتا ہے مگر یہ سدا بہار موسم اپنے اندر وہ تمام لطافتیں رکھتا تھا جو موسم گرما میں ہوتی ہیں اور جن سے پھلوں میں پختگی کا گداز پیدا ہوتا ہے۔ یہ موسم سمنستان میں گیارہ مہینہ کا ہوا کرتا تھا اور بارہواں مہینہ سرما کا سمجھا جاتا تھا۔ ہر چند کہ اس موسم میں وہاں کے باغات باشندوں کے لئے آذوقہ بہم پہنچانے سے عاری ہو جاتے تھے۔ لیکن چونکہ اس موسم کی عمر بہت مختصر ہوا کرتی تھی، اس لئے سمنستان والوں کے لئے یہ ایام بھی غیر معمولی مسرت سے معمور ہوتے تھے۔ اُن کی شامیں اپنے اندر نئے اسباب عیش اور اُن کی صبحیں جدید مشاغل مسرت لے کر آتی تھیں۔ موسم سرما میں جب کہ خوبانیوں کی بہم رسانی موقوف ہو جاتی، جو اُن کی تنہا غذا تھی، تو وہ قرب و جوار کے لوگوں سے اخروٹ اس شرط پر قرض لے لیا کرتے تھے کہ جس روز چاند آسمان پر اپنے پورے

دامنے کو لئے ہوئے طلوع ہوگا، اس کے دوسرے روز خوبانیوں کی شکل میں ادا کر دیں گے۔ اور یہ لوگ اس تبادلۂ تجارت کے لئے اخروٹوں کی معقول مقدار ایک دوسرے قطعۂ ملک سے لایا کرتے تھے۔

اہل سمنستان نے اپنے ملک میں ریشم کے کیڑوں کو یہ فن سکھا دیا تھا کہ صرف ریشم پیدا کرنے پر ہی بس نہ کریں بلکہ اُس سے نفیس ریشم کی چادریں بھی تیار کیا کریں اور اس طرح وہ کیڑے اس لطیف آبادی کے لئے رنگین، خوبصورت، ریشمی ملبوس طیار کیا کرتے تھے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انھیں ریشمی کیڑوں کی یہ صنعت تھی جس نے اس ملک کی آبادی کی لطافت کو مکمل کیا ورنہ اُس کے پاس کوئی اور ذریعہ تن پوشی کا نہ تھا۔

ساتواں دن تقریب کا خاص دن تھا اور جشن کا مخصوص یوم مسرت۔ جس دن ساتویں صبح صادق طلوع ہوئی تو تمام سمنستان ترنم آباد نظر آتا تھا اور ہر شخص قصر شاہی میں اک مہمان کی حیثیت سے موجود۔ ہر متنفس شوق و ولولہ سے لبریز تھا مگر وزیر تشریفات متردد۔ وزیر تشریفات بولا "میری تمنا ہے کہ ہر کام باقاعدہ خوش اسلوبی سے انجام پا جائے" مگر یہ کیونکر توقع کی جاسکتی تھی، جبکہ مہمانوں کے شوق کا یہ عالم تھا کہ وہ بجائے انتظار کے جو عوائد شاہی کے لحاظ سے ضروری تھا، جوق جوق ہنگامہ کناں آرہے تھے اور مست مسرت ہوکر باہم گلبازی کرتے ہوئے "حلقۂ گل" کے رقص میں منہمک، وزیر تشریفات کو اپنے ہجوم میں لپیٹتے ہوئے قصر میں داخل ہو رہے تھے۔ وزیر تشریفات بھی خوش تھا اور علے الخصوص اُس وقت جب کہ اُس نے ہمسایہ سلطنتوں کی شاہزادیوں کو محل میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ اس لئے آئی تھیں کہ شاہزادی سمنبر کی منہ بولی مائیں بنیں۔

ہر منہ بولی ماں اپنے زریں ہوادار سے جن میں ہوائی گھوڑے جُتے ہوئے تھے، محل کے دروازے پر اُتری۔ وزیر تشریفات ان کو آتے ہوئے دیکھ کر بے انتہا مسرور ہوا اور اُن کی پذیرائی کے لئے دروازہ تک آیا اور تعظیم میں اس قدر جھکا کہ اس کا چشمہ بھی زمین پر گر پڑا۔

ان شاہزادیوں نے جب اپنے منہ بولے بچہ کو دیکھا تو بیتابانہ سراپا شوق و ابتہاج بنکر اُس کے گرد حلقہ کرکے آگئیں۔ شاہزادی سمنبر اس وقت گویا ایک کلی تھی جس کے گرد تیتریاں اپنا ہنگامۂ رقص قائم کئے

ہوئے تھیں۔ ہر شاہزادی اپنے منہ بولے بچے کے لئے بیش بہا تحائف لائی تھی اور ان میں سے ہر ایک کی یہی خواہش تھی کہ سب سے پہلے وہی اپنے تحائف پیش کرے۔ چنانچہ جوشِ محبت اور شوق اولیت میں سب کی سب ایک ہی وقت میں شاہزادی سمنبر سے مخاطب ہوئیں، گویا شاہ دانہ کے درخت میں چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ دربارِ شاہی کا مورخ اپنی قلم کی انتہائی سرعت کے باوجود اُن نوادر و تحائف کی نصف فہرست بھی مرتب نہ کر سکا جو شہزادی کو اس وقت دئے گئے۔

مراسم ختم ہوئے اور منہ بولی مائیں ایک ایک کر کے رخصت ہوئیں، ہنوز آخری منہ بولی ماں، شہزادی کا رخصتی بوسہ لے ہی رہی تھی، کہ ایک شور سنائی دیا۔ ہر شخص اس طرف متوجہ ہو گیا اور چشم زدن میں لطف و مسرت کا تبسم جو ہر چہرہ کا ایک مستقل جز نظر آرہا تھا، دفعۃً مفقود ہو گیا، اور رقص و سرود موقوف۔ کیونکہ شاہزادی قاہرہ بھی منہ بولی ماں بننے کے لئے آئی تھی اور لوگ اُسے منحوس سمجھتے تھے۔ اس کے ہوادار کا رنگ سیاہ تھا اور سیاہ گھوڑے اُس میں جُتے ہوئے تھے۔ سمنستان کے شاہی خاندان کے لئے پرانے تعلقات کی بنا پر اس کی پذیرائی ناگزیر تھی۔

وزیرِ تشریفات کے لئے ازروئے قواعد، نوید بھیجنا ضروری تھا اگرچہ سب واقف تھے کہ اس کا شریک ہونا خوش گوار نہ تھا۔ چنانچہ اس تقریب کا نوید شاہزادی قاہرہ کے نام لکھا تو ضرور گیا مگر ملکہ سمنستان نے اُس کے نام کا خریطہ نکلوا کر درباری کمرے کے ایک طاق میں ڈالدیا تھا۔ "ہم ہمیشہ کہہ سکیں گے"، ملکہ نے کہا کہ "نوید کا رہ جانا ایک اتفاقی امر تھا۔"

قاہرہ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا تھا اور وہاں کوئی عذر پذیرا نہیں ہوتا تھا۔ اُس نے شہزادی کے پیدا ہونے کی خبر سُنی اور آموجود ہوئی۔ ملکہ نے مصنوعی عذر پیش کیا لیکن قاہرہ نے غضبناک نظروں سے اُس کی طرف دیکھکر کہا کہ "میں اچھی طرح جانتی ہوں کہ اب میں ضعیف ہوتی جا رہی ہوں اور کوئی مجھ سے محبت نہیں رکھتا تاہم مجھے اصرار ہے کہ میں نوزائیدہ کی منہ بولی ماں بننے کے فخر سے نہ روکی جاؤں اور جو ادنیٰ تحفہ میں لائی ہوں وہ اپنی منہ بولی بیٹی کو دے سکوں۔" یہ کہتی ہوئی وہ شہزادی سمنبر کے نفیس و نازک گہوارہ کی جانب بڑھی، جہاں ننھی شہزادی ہمک رہی تھی اور اک مایوسانہ انداز میں جھک کر کہنے لگی "سرزمین گلاب میں پیدا ہونے والی میری سمنبر تو ایک گلاب کی طرح ہمیشہ سینچی جائیگی۔" ملکہ ایک اطمینان آمیز ٹھنڈی سانس لے کر خود ہی کہنے لگی "کیا واقعی قاہرہ اس مرتبہ ایسا عمدہ سلوک کرنا چاہتی ہے" مگر نہیں وہ ہرگز ایسا

ارادہ نہ رکھتی تھی کیونکہ آخری آہِ سرد کے ساتھ اُس نے کہا" ایک گلاب کے مانند پرورش کی جائیگی کیونکہ تیری شادی ایک باغبان کے لڑکے سے ہونے والی ہے" بادشاہ، ملکہ اور مورخِ دربارشاہی نے، (جو ہر وقت گوش برآواز رہتا تھا) یہ جگرخراش کلمات سُنے اور شاہزادی قاہرہ جاہ ہی جلدی قدم مار کر اپنی گاڑی میں سوار ہوئی اور چلی گئی۔

یہ تھا اُس حسین بچے کا مقسوم؛ یہ تھی شاہزادی سمنبر کی قسمت۔

(۲)

یہ واقعہ جگرخراش تھا اور ایسا جگرخراش کہ بادشاہ نے اسی غم میں جان دیدی۔ اُس نے خوبانیوں کا کھانا ترک کر دیا اور گلاب کا سونگھنا موقوف، کیونکہ اسکی غیور طبیعت اُس بات کو برداشت نہ کرسکی کہ اسکی بیٹی ایک باغبان کے لڑکے سے منسوب ہو۔ جب وزیر تشریفات نے عوائد خاندانی کی کتاب زریں" میں سے وہ دفعہ پڑھ کر سنائی جس میں درج تھا کہ" سمنستان کی شاہزادی صرف اُن چھ شاہی خاندانوں میں سے کسی ایک شاہزادہ کے ساتھ بیاہی جاسکتی ہے جن کو شاہنشاہ اعظم کا لقب حاصل ہے"، تو بادشاہ کے چہرہ کا رنگ اُڑگیا اور آخرکار دو دن اس صدمہ میں مبتلا رہ کر اسنے جان دیدی بادشاہ کے بعد ملکہ بھی زندہ نہ رہ سکی اور گلاب کے جھنڈ میں بادشاہ کی قبر کے برابر دفن کردیگئی۔

اب صرف ایک شخص یعنی مورخِ دربارشاہی باقی تھا، جسے شہزادی کے متعلق اِس پیشینگوئی کا علم تھا اُس نے اپنی کتاب میں یہ واقعہ لکھا تو ضرور، مگر اُسے بالکل راز رکھا۔ چونکہ سمنستان کے لوگ تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے اور انھیں یا کسی کو بھی اس حقیقت کا علم نہ تھا، اس لئے شاہزادی سمنبر کو دایہ نے محل شاہی کے باغات میں باغبان کے لڑکے کے ساتھ کھیلنے سے نہ روکا کیونکہ کوئی اور بچہ اس کے کھیلنے کے لئے موجود نہ تھا۔ شاہزادی اُس لڑکے کے ساتھ کھیلتی رہی اور بڑھتی رہی سمنستان کے قریب قریب جو سلطنتیں تھیں وہ اس قدر دور تھیں کہ وہاں کے شاہزادے کھیل سے فارغ ہو کر غروب آفتاب کے وقت تک اپنے مکان واپس نہ پہونچ سکتے تھے۔ ایک ریاست کا ولی عہد شاہزادی کے ساتھ کھیلنے کے لئے منتخب بھی کیا گیا مگر وزیر تشریفات نے یہ شرط لگادی کہ وہ شاہزادی کے ساتھ کھیل میں شریک ہوسکتا ہے لیکن اس شرط کے ساتھ کہ جب شاہزادی اس کی طرف گیند لینے کو آئے تو وہ تعظیماً ایک مرتبہ جُھک جائے اور جب وہ شاہزادی کی طرف گیند پھینکے تو اسی طرح سات بار تعظیم دے کر کیونکہ عوایدِ شاہی کی کتاب زریں" کا یہی حکم ہے، مگر اس

نواب زادے کے اتالیق نے ان شرائط پر اعتراض کیا اور شاہزادی پھر اسی طرح تنہا رہ گئی۔ وزیر تشریفات نے شاہزادی کی اس تنہا حالت پر بہت افسوس کیا کیونکہ وہ رحمدل بھی تھا۔ اور اسی لیے جب اُس نے شاہزادی کو باغبان کے لڑکے کے ساتھ خوبانی کی جھاڑیوں میں آنکھ مچولی کھیلتے دیکھا تو مزاحمت نہ کی کیونکہ کتاب زریں" میں، جو قانون دربار شاہی کی حیثیت رکھتی تھی یہ کہیں نہ لکھا تھا کہ شاہی بچے باغبان کے لڑکوں کے ساتھ نہ کھیلیں اور چونکہ باغبان کے لڑکے کوئی خاص معاشرتی حیثیت نہیں رکھتے اِس لیے اس کے خیال میں اُن کا کوئی ایسا وجود نہ تھا جو نقصان رساں ثابت ہو۔

سمنبر ہر روز باغبان کے لڑکے کے ساتھ کھیلتی تھی یہ لڑکا خوش رو تھا اور ذہین بھی، پھر یہ کہ کھیلنے کے لئے ہر وقت تیار۔ آخر کار شہزادی کو اُس کے ساتھ دلچسپی پیدا ہوگئی اُس نے شاہزادی کو سکھایا کہ جب بلبل گلاب کے جھنڈ سے شاہزادی کی گود میں دفعتہً آجائے تو شاہزادی کو کیا کہنا چاہیے اور جب مولا نظر آئے تو کیونکہ وقت کا شمار کرنا چاہیے اگر کسی پھلی میں بارہ دانہ نکل آئیں تو کیوں اُسے مبارک سمجھنا چاہیے، اور ماہ نو کو دیکھ کر کیا کہنا چاہیے۔ وہ شاہزادی کے ساتھ کھیلتا تھا اُس سے باتیں کرتا تھا اور اُس کے ساتھ باغوں میں گھوما کرتا تھا وزیر تشریفات جب ان دونوں کو ساتھ دیکھتا تو متبسم ہوتا اور اس مسئلہ پر جس قدر زیادہ غور کرتا اُسی قدر زیادہ اس نتیجہ پر یقین کرتا کہ باغبان کے لڑکے کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

ایک دن شہزادی کے کمرہ میں ایک بھونرا چلا آیا، دایہ اس کو نکالتی ہوئی دربادی کمرے تک جا پہونچی جہاں دربار شاہی کی تاریخ، جسے شاہی مورخ نے مرتب کیا تھا، میز پر رکھی تھی۔ دایہ نے یہ کتاب ہاتھ میں لے لی تاکہ بھونرے کو اُس سے مار دے، لیکن اس کے بعد جب اُس نے اُس کتاب کو کھولکر دیکھا اور اس کی نظر اُن فقروں پر پڑی جہاں مورخ نے قاہرہ کی پیشینگوئی درج کی تھی، تو دایہ اُس کو پڑھ کر سہم سی گئی اور وہاں سے نکلکر سیدھی باغ میں پہونچی جہاں شاہزادی، مالی کے لڑکے کے ساتھ کھیل رہی تھی چنانچہ اُس نے مالی کے لڑکے کو فوراً چلے جانے کا حکم دیا اور وہ باغ کے دروازے سے باہر نکل گیا لیکن بہت ملول و غمگین دوسرے دن شہزادی سمنبر کے کھیلنے کے لئے کوئی نہ تھا۔ شاہزادی کھیل سکتی تھی، ورنہ کوئی اور کام کرسکتی تھی سوا اس کے کہ ایک شاہزادی بنی بیٹھی رہے۔

اس واقعہ کے بعد شاہزادی سمنبر کی شاہانہ سواری شہر میں دوبارہ نکلی۔ اسکی گاڑی ہمیشہ عنبر بیز اور رنگین پھولوں سے آراستہ اور مخملی اور قاقمی پردوں سے مزین ہوا کرتی تھی۔ وہ گاڑی کے اندر انجم افشاں چتر کے سایہ

میں اپنے شاہانہ حسن کی تمام لطافتوں کے ساتھ بیٹھا کرتی تھی، اور جب گاڑی حرکت کرتی تھی تو چاروں طرف سے عبیر و گلال اڑا اڑا کر ساری فضا کو رنگین بنا دیا کرتا تھا۔ آخری مرتبہ قبل از وقت اور خلاف دستور اُس نے سواری کو محل واپس جانے کا حکم دیا اور وہاں بیٹھ کر خوب روئی ۔ وہ روتی رہی حتےٰ کہ اس کے خیال و اضطراب میں کچھ سکون ہوا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اُس نے ملکہ (اپنی ماں) کے طلسمی آئینہ کے راز کو بھی پا لیا ۔ یہ آئینہ ایک پورے پُرانے چاند سے بنایا گیا تھا اور زرو مروارید سے مرصع کیا گیا تھا ۔ اس آئینہ کا یہ طلسم تھا کہ جب کوئی رنجیدہ و ملول ہوتا اور اثر غم سے آنسو نکل کر اُس آئینہ پر پڑتے تو وہ آئینہ ایسے مناظر پیش کرتا جس سے خستہ و مضمحل ہستی مسرور ہو جاتی تھی ۔ شاہزادی کے آنسو سے وہ آئینہ پُر نم ہو چکا تھا اور جب اُس نے آئینہ پر نگاہ ڈالی تو اُس کے سامنے دُو مروارید ی آنکھیں تھیں ۔ شاہزادی نے انھیں دیکھتے ہی پہچان لیا کہ یہ اُسی باغبان کے لڑکے کی ہیں ۔ شاہزادی کو اس وقت احساس ہوا کہ وہ باغبان کے لڑکے سے محبت کرتی ہے اور وہ لڑکا بھی اُس کو چاہتا ہے ۔ اب اُس نے اپنی آنکھوں کو خشک کیا اور آئینہ کو مکرر دیکھا مگر اب آئینہ اُس عکس سے خالی تھا اور اب وہ کچھ نہ تھا مگر کہنہ ماہتاب کا ایک ٹکڑہ ۔ شاہزادی اس واقعہ سے بہت مضمحل ہو گئی اور اُسکی غم آگینی چہرہ سے ظاہر ہونے لگی ۔

دایہ کمرہ میں داخل ہوئی اور شاہزادی کی حالت دیکھ کر سمجھی کہ میری سمن آسا شاہزادی کو کسی ایسی چیز کی ضرورت ہے، جو اُسے مسرور کرے چنانچہ دوسری صبح طلوع آفتاب کے ساتھ ہی وہ کچھ اسباب تفریح بھی لیکر آئی جو اس کے نزدیک شاہزادی کا دل بہلا سکتے تھے، مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوئی ۔

(۳)

سمنستان میں تاریخی واقعات رونما ہونا شروع ہوئے، جہاں کوئی نہ چاہتا تھا کہ اُن کا وقوع ہو ۔ سمنستان کے باشندے شاہزادی کی پیدائش کے بعد سترہ سال تک دنیا کے کسی نئے واقعہ سے خبردار نہیں ہوئے، سوائے اس کے کہ موسم غیر معمولی طور پر لطف انگیز تھے اور وہ لوگ بھی اُن سے غیر معمولی طور پر بہت مسرور رہے ۔ شاید وہ لوگ باخبر تھے کہ تاریخ نام ہے غیر خوشگوار واقعات کا جن کے اعتراف سے وہ مکدر ہونا پسند نہ کرتے تھے ۔

افسوس ہے کہ شاہزادی تمنبر کی سترہویں سالگرہ میں مسرت اندوز و لطف آفریں سرزمین سمنستان کے

لئے واقعاتِ تاریخ کا ناخوشگوار خلل شروع ہو گیا۔ ایک سہانی و دلفریب صبح کو (سمنبر کے اقلیم حکمرانی میں ہر صبح نہایت دلفریب اور سہانی ہوا کرتی تھی) سب سے پہلے شاہزادی سمنبر نے جس سے ملاقات کی وہ شاہزادی وِلرَس تھی۔

شاہزادی دِلرَس نے اپنے آنے کی کوئی اطلاع شاہزادی سمنبر کو نہیں دی تھی، صرف اتنا کہا تھا کہ وہ شہزادی ولرَس ہے اور کسی کو اس میں شک نہ ہوا کیونکہ وہ نہایت حسین و جمیل تھی اور شاہزادیوں کی طرح شاہانہ لباس زیب تن کئے ہوئے تھی مگر حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ زار زار رو رہی تھی۔ وزیر تشریفات خود اس کو درباری ایوان میں لے گیا جہاں شاہزادی سمنبر، وزیر تشریفات کی نہایت مودبانہ التماس و اطلاع کے بموجب، شاہزادی ولرَس کی پذیرائی کے لئے تخت شاہی پر ریشمی تکیوں کے سہارے سے منتظر بیٹھی تھی۔ وزیر تشریفات خوش تھا اور وہ ہمیشہ خوش ہوا کرتا تھا، اگر آداب دربار پورے طور پر ملحوظ رکھے جائیں۔ شاہزادی دلرَس جب خم تعظیم دینے لگی تو اس کے آنسو فرش پر گرنے اور شاہزادی سمنبر جو خود بھی باغبان کے لڑکے کی گم شدگی سے مغموم و متالم تھی یہ دیکھ کر اپنی آنکھوں کے بڑے بڑے موتی بکھیرنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔ اسوقت ساری فضا حسرت و الم کی زبان بنی ہوئی تھی۔ ایوان کے فوارے کی تراوش قطرات بھی اشک ریزی کا حکم رکھتی تھی اور فوارہ پر جو طوطی بیٹھا تھا وہ بھی اپنی دردناک آواز سے گویا غمزدگی کا اظہار کر رہا تھا۔

ہر چند تاریخ اہل سمنستان کے لئے ایک غیر دلچسپ موضوع تھا اور وہ کبھی کوئی ایسی بات نہ کرتے تھے جس میں تلمیحی اشارے پائے جائیں، لیکن ملکہ سمنبر کچھ نہ کہہ سکی۔ شاہزادی دلرَس نے تاریخ سے زیادہ خشک باتیں جغرافیہ کے متعلق شروع کر دیں۔ منجملہ اور وجوہ کے کہ شہزادی سمنبر اور اس کی رعایا کیوں جغرافیہ سے متنفر تھی، ایک یہ بھی تھی کہ ان کے ہاں جغرافیہ کی کتاب، جس کی آخری جلد انھوں نے اپنے ردی اسباب کی تہ میں دبا دی تھی، اس فقرہ سے شروع ہوتی تھی کہ "سمنستان کی شمالی سرحد پر سلطنت سنگستان واقع ہے" ہر متنفس جانتا تھا کہ وہ اگر جانب شمال جائے گا تو سنگستان میں پہونچے گا۔ لیکن وہاں پہونچنا کس کو گوارا تھا اور ایسا بے وقوف کون ہو گا جو وہاں جانا چاہے گا۔ ان کے لئے تو اس ملک کا ذکر تک جام سرور میں تلخابۂ غم ملا دینے کا مصداق ہوا کرتا تھا۔ سمنستان کے عجائب پسند طبقہ کے لوگوں کو، جو جھینگری کی طرح صرف "رقص رنگین" میں زندگی بسر کرنے کے عادی تھے، وہاں کا خیال بھی سخت اذیت رساں تھا۔

سمنستان اور سنگستان کے درمیان آہنی ستونوں کی ایک قطار سے حدِ فاصل مقرر کر دی گئی تھی اور یہ ستون باہم خاردار تاروں سے ملا کر چھپا دیے گئے تھے۔ یہ تعمیر حدود سنگستان کی سلطنت کی جانب سے ہوئی تھی اور سمنستان کی حکومت نے عشق پیچاں کی بیلوں سے اس کو چھپا دیا تھا، کہ اگر کوئی سمنستان کا باشندہ اس حد تک جا نکلے تو اس حد بندی کا نظارہ اس کے نظر و تخیل کو صدمہ نہ پہنچائے۔

(۴)

سنگستان ایک نہایت ویران و غیر شاداب ملک تھا اور حد درجہ خوفناک۔ وہاں کا قانون ہر اس شخص کو، جو "براہ کرم" یا "شکریہ" یا ایسے اور الفاظ کا استعمال کرتا جن سے شائستگی و سلاست، تہذیب و ملائمت اور تعظیم و تکریم کے پہلو نکلتے ہیں سزا کا مستحق قرار دیتا تھا۔ عقابِ سیزدہم، سنگستان کا حکمراں ایک کریہ المنظر مکان میں رہتا تھا، جہاں نہ کوئی صفائی تھی نہ آراستگی اور جو سوائے کرختگی و درشتگی کے کوئی اور منظر پیش نہ کرتا تھا۔ سنگستانیوں کی تعلیم میں بدمزاج بنا دینے والا عنصر بیش از بیش ہوتا تھا۔ یہاں کا بادشاہ اگر کسی تقریب کے موقع پر کوئی تقریر کرتا، تو وہ اپنے خاندان کے حکمرانوں کے واقعات عقاب اول سے لیکر عقاب سیزدہم تک مفتخرانہ بیان کرتا، جن سے انتہائے وحشت ظاہر ہوتی تھی۔ لیکن اسی سلسلہ میں جب وہ عقاب ہفتم کا ذکر کرتا تو نہایت ذلت و تحقیر کے ساتھ، کیونکہ اُس نے ایک بار کسی مسافر سے نرمی کے ساتھ گفتگو کی تھی۔ شاہ سنگستان تمام تمام دن ایک ناتراشیدہ پتھر کے تخت پر چمڑے کے لباس میں بیٹھا رہتا اور کچا گوشت اپنے پالے ہوئے عقابوں کو کھلاتا رہتا۔ سنگستان میں ہر شخص کچا گوشت کھاتا تھا۔ وہاں پھول کے درختوں کا پتہ نہ تھا، پھل پیدا ہی نہ ہوتے تھے اور گانے والا کوئی پرند اس فضا میں زندہ نہیں رہتا تھا، وہاں کے مکانات کبھی صاف نہ کیے جاتے تھے۔ عقاب سیزدہم کی خواہش تھی کہ تمام دنیا کو اپنے ملک کی وضع پر آباد کرے۔ اس کا خیال تھا کہ تین لاکھ خونخوار اور غضب آلود فوج سے وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ اس کے پاس اس قسم کی صرف ایک لاکھ فوج تیار تھی، اور دو لاکھ کی کمی پوری کرنے کے لیے وہ سمنستان پر قابض ہو جانا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہیں سے اُسے دو لاکھ آدمی اور مل سکتے تھے۔ بالکل یہی حیثیت علاقہ عسلستان کی تھی جو سنگستان کے دوسری جانب واقع تھا اور ایک ملکہ کی زیر حکومت تھا۔ عقاب سیزدہم نے پہلے ملکہ عسلستان کو اپنی شادی کا پیغام بھیجا۔ ملکہ عسلستان اس خبر کے سنتے ہی سراسیمہ و پریشان ہو گئی۔ چند روز تک وہ بہت متردد رہی اور کوئی لمحہ اس کا ایسا نہ گزرا کہ وہ سے گریہ و زاری میں صرف

نہ کرتی ہو۔ بالآخر اُسنے جز ائر ارغوان کے نواب کو جو عسلستان کے قبضہ کا متمنی تھا، تمام علاقہ سپرد کر دیا اور خود شاہزادی وارث کا لقب اختیار کر کے روپوش ہوگئی اور سمنستان کی حکمران شہزادی سمنبر کے پاس تمام واقعات کی اطلاع دینے پہونچ گئی۔ یہاں وہ ایک گھنٹہ کے قریب ٹھہری تاکہ سمنبر کو ہوشیار کر دے کہ اب اُس کی باری ہے اور اس کے بعد رخصت ہوگئی۔

دوسرے ہی دن عقاب سیز دہم کا پیغام شادی ایک بھدے سے لفافہ میں، جس پر عقاب کی تصویر بنی ہوئی تھی اور جس سے کچے گوشت کی بو آرہی تھی پہونچا۔ اس نے القاب و آداب میں کاغذ ضایع نہیں کیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ "خط کے پہونچنے کے ۲۴ گھنٹہ کے بعد اسکی فوجیں سرحد پر منڈلا رہی ہونگی۔"

سمنستان کی آبادی اس عبارت سے بہت برہم ہوئی۔ شاہزادی سمنبر کے ہاتھ میں عقاب سیز دہم کے خط کا جو انجام ہوا وہ یہ تھا کہ اُس خط کے پرزے پرزے کر ڈالے گئے اور قدموں کے نیچے مسل دیا گیا۔ لیکن اس کے بعد نتیجہ کے خیال سے شاہزادی بہت متردد ہوئی۔ وہ ہر شخص سے بہترین مشورہ کی طالب ہوئی مگر سمنستان والے کوئی مشورہ اِس کے سوا نہ دے سکے کہ ایسا مبارک و خوشنما دن اِس فکر میں ضایع نہ کرنا چاہئے بلکہ کوئی خاص اور نئی قسم کے سیر و تماشے کا انتظام کرنا چاہئے کہ ہم اس غم کو بھلا سکیں۔

لیکن وزیر تشریفات اور شاہی مورخ نے موقع کی اہمیت کا اندازہ کر کے صلاح دی کہ قبل اس کے کہ عقاب سیز دہم سرحد میں داخل ہو شاہزادی کا عقد کسی اور شخص کے ساتھ ہو جانا چاہئے اور یہی ایک صورت پناہ کی ہو سکتی ہے۔ شاہزادی سمنبر نے کہا کہ "اگر میرے لئے ایسا کرنا ضروری ہے تو میں طیار ہوں مگر سوائے اُس باغبان کے لڑکے کے میں کسی اور کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی۔" دونوں کے چہروں کا رنگ فق ہوگیا، مورخ کو پیشینگوئی یاد آئی اور وزیر تشریفات خاموش ہوگیا۔ وزیر نے نہایت ادب و احترام کے ساتھ کہا کہ "شاہزادی یہ تو بالکل ناممکن ہے کیونکہ اگر شاہزادی نے سوائے اُن سات حکمراں خاندانوں کے، جن کے نام کتاب زریں میں درج ہیں، کہیں اور شادی کی تو حکومت سے دست بردار ہونا پڑے گا اور قانون سلطنت کے مطابق شاہزادی کے تمام حقوق ساقط ہو جائیں گے، حکومت، ہمسایہ سلطنت کو تفویض ہو جائے گی اور وہ ہمسایہ حکومت عقاب سیز دہم ہی کی ہو سکتی ہے۔" شاہزادی بے حد غمگین اور محزون ہوئی اور اس کے گل آسا رخساروں پر آنسو کے مصفا موتی بکھرنے لگے۔ وزیر تشریفات نہایت متاثر ہوا اور کہنے لگا "کم سے کم ہمیں پیغامات تو ضرور روانہ کرنے چاہئیں ممکن ہے کوئی حسین اور لطیف مزاج شاہزادہ ایسا مل جائے جس کے ساتھ شاہزادی سمنبر کی شادی ہو سکے۔"

چنانچہ چھ سمیع السیر کبوتروں کے ذریعہ سے یہ پیغام روانہ کردئے گئے، سمنبر اس وقت سے برابر روتی رہی اور خواب وخور اپنے اوپر حرام کرلیا۔ صبح کے وقت جب مورخ دربار شاہزادی کے پاس آنے کی اجازت حاصل کرکے شاہی کمرے میں داخل ہوا، تو وہ نہایت خوف زدہ اور پریشان تھا۔ باربار باہر دیکھتا جاتا تھا کہ عقاب کے آنے کی اطلاع تو نہیں آئی۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اُس نے دیکھا کہ بجائے عقابی علامتوں کے سات امرا ہلکے آسمانی رنگ کے ریشمی لباسوں سے آراستہ، ایک جلوس کی صورت میں محل کے صدر دروازہ سے داخل ہوئے۔ اِن کے گلے میں نہایت حسین و آبدار مروارید کی ہار پڑے ہوئے تھے، ہاتھوں میں نقرئی چوبیں اور پھولوں کے گلدستے تھے اور ان کے جلو میں ایک نوجوان شاہزادہ تھا جو نہایت عجلت سے محل کے اندر داخل ہوا۔ شاہزادے نے تمام مراسم آداب شاہی کے نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ شاہزادوں ہی کی طرح ادا کئے، اور اُن تمام جزئیات کا خیال رکھا، جن کی توقع ایک شاہزادے سے کی جاتی ہے، جب وہ کسی شاہزادی کو پیغام محبت دینے آئے۔ اس نے ایک میز پر ایک خوبصورت صندلی صندوقچہ جو بڑے بڑے عقیق احمر، الماس تاباں اور زمرد اخضر سے لبریز تھا اس طرح رکھا گویا ان چیزوں کی اس کی نظر میں کوئی وقعت نہ تھی۔ جس وقت وہ شاہزادی کے نزدیک پہونچا تو خم تعظیم میں اپنا سر گھٹنوں سے ملا دیا۔ شاہزادے کی شادمانی وخوشی کا اظہار اُس کی خفیف سے خفیف حرکت سے عیاں تھا اور ایسی حرکات بے شمار تھیں کیونکہ یہ آئیو الا شاہزادہ وہی باغبان کا لڑکا تھا وزیر تشریفات اور مورخ بیک وقت کچھ پوچھنا ہی چاہتے تھے کہ شاہزادہ اُن کا منشا سمجھ گیا اور بولا کہ "ہاں میں باغبان کا لڑکا ہوں" وزیر تشریفات نے کہا "شاہزادی سمنبر تو کسی ایسے شخص سے شادی نہیں کرسکتی جس کا تعلق شاہنشاہان عظام کے خاندانوں سے نہ ہو۔"

شاہزادہ نے جواب دیا "میں انھیں خاندانوں میں سے ایک خاندان کا فرد ہوں، کیونکہ میں کوہستان کی سلطنت کا جہاں سیوتی کے پھول کھلتے ہیں اور جہاں بلبلیں پیدا ہوتی ہیں، ولی عہد ہوں۔ ہمارا خاندان ساتوں شاہی خاندانوں سے زیادہ قدیم ہے اور ہم اپنے جد اعظم کی یادگار میں اپنے بیرقوں پر ایک ورق زر کو ہلالی کی شکل بناکر لگاتے ہیں۔ میرے باپ کے خطابات میں ایک خطاب "نواب اعظم ارم آباد" بھی ہے۔ ہمارے خاندان کی ایک قدیم رسم ہے کہ ہر ولی عہد سات سال تک باغباں کے لڑکے کی حیثیت سے زندگی بسر کرتا ہے، چنانچہ میں نے بھی اس کی تعمیل کی اور تمہارے باغ میں رہنا پسند کیا کیونکہ وہ بے حد خوبصورت و دلچسپ باغ ہے۔ شاہزادی کیا تم باغبان کے لڑکے کے ساتھ شادی کرنا پسند کروگی؟"

شاہزادی سمنبر نے ایک ابتسام شیریں کے ساتھ اظہار پسندیدگی کیا۔ مورخ نے نہایت خوش ہو کر اہرہ کی پیشینگوئی کا اعادہ کیا اور وزیر تشریفات نے کہا کہ یقیناً عقاب، شام سے قبل یہاں پہونچ جائے گا۔

شاہزادی سمنبر کی شادی کے مراسم ادا کیے گئے اور تھوڑی دیر میں اُن سے فراغت ہو گئی۔ سمنستان کے باشندے مدعو ہوئے اور رقص و سرود کی رنگینیوں میں سب مصروف و محو ہو گئے، کیونکہ ان کو تو یسے مواقع کی تمنا و جستجو کرنے کے سوا اور کوئی کام ہی نہ تھا۔ گویا وہ وہیں کہیں چھپے ہوئے اس گھڑی کا نتظار ہی کر رہے تھے۔

(۵)

عقاب سیزدہم، سمنستان تک کبھی نہ پہونچا کیونکہ وہ بھی ایک پیشینگوئی میں مبتلا تھا۔ اس کو نایا گیا تھا کہ ''عقاب سیزدہم'' اگر ''عقاب اعظم'' کا لقب حاصل کرنا چاہے، تو نو منزل کے ایک مکان سے ست کرے اس حال میں کہ اس کے ہاتھ پر ایک جوڑا عقاب کا بیٹھا ہو۔ اگر وہ بجائے نیچے آنے کے صعودی حالت اختیار کر سکے، تو عقاب اعظم کا لقب اختیار کر سکتا ہے۔ چنانچہ اُس نے اُس کا تجربہ ٹھیک اسوقت کیا جبکہ وہ سمنستان کو روانہ ہو رہا تھا۔ جب وہ زمین پر گرا اور اس کا جسم پاش پاش ہو گیا تو عقاب کا وہ جوڑا جو اس کے ہاتھ پر بیٹھا تھا اس کا گوشت لیکر ہوا میں صعود کر گیا۔

(مختار)

ل۔ احمد

ایک نقاش کا راز

دنیا کے نقاش آ آ کر اس سے پوچھتے تھے کہ ''تو یہ رنگ کہاں سے لاتا ہے، جو تیری تصویر ایسی آبدار و شگفتہ نظر آتی ہے۔ ہم نے صحرا کے ایک ایک پھول سے اس کی رنگینی کو حاصل کیا اور اپنی تصویروں میں بھر کر دیکھا، لیکن وہ گہری اور دل میں گھر کرنے والی سرخیاں جو تیرے نقوش میں نظر آتی ہیں، ہمیں حاصل نہیں،، اک زمانہ گزر گیا اور وہ بدستور اسی طرح خاموشی سے اپنی تصویروں میں رنگ بھرتا رہا۔

ایک صبح جب وہ نقاش اپنے حجلۂ نقاشی میں مردہ نظر آیا اور اس کا لباس اُترا تو دیکھا گیا کہ اس کے پہلو میں ایک زخم تھا، تازہ، رنگین اور نہایت گہرا۔

نیاز

شامِ جمن

(ایک صناع کے نقطۂ نظر سے)

تری خاموشیوں پر رُودِ جمنا جان و دل صدقے
غریقِ حُسنِ منظر کر لیا ہے لطفِ منظر نے،
جوانی نے تری گم کر لیا ہے اپنے جلووں میں،
شفق نے بھی لگا کر آگ مغرب میں بجھا دی ہے
اک ہلکی روشنی سی چھا گئی ہے سارے منظر پر،
طلسمات افق میں کھو گئی، آخر نظر پڑ کر،
بسیرا لینے والے غول سے بچھڑا ہوا طائر،
وہ اپنی جھونپڑی میں لو مچھیرے نے دیا جوڑ؟
کسے معلوم اس ویران پرستشگاہ کا عالم
خرامِ نازِ بیدار جوانی میں، قیامت زا،
جھجک دوشیزگی کی کچھ چرائے جسم سے ظاہر،
بدن میں اپنی تنہائی کے ڈر سے تھرتھراہٹ سی،
کچھ اپنے دل ہی دل میں سوچتی اندر چلی آئی
دیا مورت پہ رکھا پہلے، لیکر اپنی تھالی سے،
دوزانو بیٹھ کر پھر کس عقیدت سے دعا مانگی،
نہیں معلوم تاریکی کے پیچھے اور کیا کیا ہے،
بدن میں سنسنی پیدا ہے، اک ہیبت سی چھائی ہے
سکوتِ روح پرور میں نہاں ہے رازِ سربستہ
مجھے تحلیل کر لے یہ تماشہ اپنے افسوں میں،
میں کیسے جا ملوں اس انجمن کی رنگ رلیوں میں؟

مرے حزنِ دروں کی داد ہے تیری سکوں کوشی۔
نمودِ سیمیا کیا اور بھی جادو اثر ہوگی؟
کہیں زائل نہ ہو جائے یہ سامانِ راحتِ جاں کا ذ
مگر کچھ جاں بلب شعلوں کے افسردہ سنبھالوں سے
کسی مرتے ہوئے کا جیسے دم اک دم کو لوٹ آئے۔
حواسِ باطنی ڈوبے ہوئے ہیں بحرِ حیرت میں۔
نشیمن کی طرف کس بدحواسی سے جھپٹتا ہے۔
وہ دہقانی شوالہ سے صدا ناقوس کی اٹھی،
کہ دنیا کی نگاہوں سے نہاں واں کون آتی ہے ذ
جبینِ عجز کا طالب ہر اک نقشِ قدم جس کا ذ
تبسم ریز نظروں سے مرادوں کی جھلک پیدا ذ
عقیدت مند دل میں شوقِ تجدیدِ پرستش کا ذ
مقابل دیوتا کے با خلوصِ دل کھڑی ہو کر ذ
چڑھائے کانپتے ہاتھوں سے پھر کچھ پھول شرما کر ذ
خدا ہی جانتا ہے اس کے دل کی آرزو کیا تھی۔
جو دیکھا سر دھنا اس پر، نہ دیکھا اس کی حسرت ہے ذ
فضا کی رمز کی سے مگر، وحشت نہیں بڑھتی ذ
سرودِ ہو کے نغمے گونجتے ہیں گنبدِ شب میں ذ
میں ان نیرنگیوں کے جذبِ پنہاں میں سما جاؤں!
میں کیونکر فطرتِ معصوم کا اک نقش بن جاؤں!

مجاز،

کیا مانی واقعی مصور تھا؟

اگر اصولِ استقرار سے کام لیا جائے، تو اُردو ادب کی رنگینیوں کا عنصرِ عظیم سراسر مختاراتؔ و مستعارات، نظر آئے گا اور مشکل سے کوئی جزو ایسا نظر آئے گا جسے ہندوستان یا یہاں کی پیداوار سے تعلق ہو۔

کسی زبان کی شاعری، بہترین معیار اس زبان کے عناصر معلوم کرنے کا ہے اور اگر اردو شاعری کا اگر تجزیہ کیا جائے، تو آسانی سے یہ حقیقت واضح ہو سکتی ہے کہ اس میں ایران کی آب و ہوا کس حد تک نفوذ کئے ہوئے ہے۔ تمام تشبیہات و استعارات، تمام جذبات و کیفیات، انھیں واقعات و حالات سے ماخوذ ہیں، جن کا تعلق سرزمینِ ایران سے ہے، درآنحالیکہ کمتر ایسے لوگ ہیں جنہیں اپنے ماخذ کی حقیقت سے آگاہی ہو۔

نرگس و سنبل، بنفشہ و بلبل کا ذکر کس شاعر نے نہیں کیا، لیکن کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہندوستان میں کبھی اس نے ان چیزوں کو دیکھا ہے اور وہ ان کی حقیقی حالات سے آگاہ ہے؟ اسی طرح بہار و خزاں کے ذکر سے دیوان کے دیوان لبریز ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ ہندوستان میں خزاں کبھی آتی ہی نہیں کہ لوگ بہار کے صحیح مفہوم سے آشنا ہوں۔

رات، ردیف و قوافی کے اشکال پر میں غور کر رہا تھا کہ کسی شاعر کی ایک غزل مجھے یاد آئی:۔

اس سفلہ روزگار میں آنکھیں کھلی ہوئی ۔۔۔ رہتی تو تھیں شمار میں آنکھیں کھلی ہوئی
آنکھوں پہ ہاتھ رکھ کے مجھے ذبح کیجئے ۔۔۔ یہ ظلم اور جبار میں آنکھیں کھلی ہوئی

جب میرا ذہن اس شعر کی طرف منتقل ہوا:۔

کیف اس کو کہتے ہیں کہ نہ مانی سے کھنچ سکیں ۔۔۔ تصویرِ بادہ خوار میں آنکھیں کھلی ہوئی

تو میں نے خیال کیا کہ اگر مانی یہ جان لیتا کہ مستقبل میں وہ صرف ایک مصور کی حیثیت سے پیش

کیا جائے گا، تو شاید وہ خودکشی کر لیتا، اور کبھی مذہب کے میدان کو اپنی فکر کا جولانگاہ نہ بناتا۔
اس لئے میں آج کی صحبت میں بتانا چاہتا ہوں کہ مانی کون تھا اور صفحات تاریخ پر اُسے کس صف میں جگہ دی گئی ہے۔

ابوریحان بیرونی، تحقیق الہند میں خود مانی کی تصنیف شابرقان کے حوالہ سے لکھتا ہے کہ "وہ ۲۱۵ء یا ۲۱۶ء میں بمقام ہمدان پیدا ہوا۔ اس کا باپ، جس کا نام پاتک تھا (عرب مورخین جسے فتق کہتے ہیں) ہمدان کے ایک شریف خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ مانی کی ماں کا نام مار، مریم یا اُتا خیم تھا، جو ایران کے قدیم شاہی خاندان اشغانی سے تعلق رکھتی تھی۔ یہ زمانہ وہ تھا جب مشرق میں زردشتی مذہب اور مغرب میں مسیحی مذہب اپنے عروج پر تھے۔ اس کا باپ چونکہ خود بھی بعد کو مسیحی مغتسلہ (Baptist) طبقہ میں شامل ہو گیا تھا۔ اس لئے ظاہر ہے کہ مانی کی ابتدائی تعلیم، جو اس کے باپ ہی کے پاس ہوئی، مسیحی معتقدات کے زیر اثر ہوئی ہوگی، لیکن خود مانی کا بیان یہ ہے کہ:

"میں ابھی جنین ہی میں تھا کہ توم فرشتہ میری ماں کو حالت خواب میں نظر آتا اور ظاہر کرتا کہ تیرے بطن سے ایک پیغمبر پیدا ہونے والا ہے۔ جب میری عمر بارہ سال کی ہوئی تو مجھ پر الہامی کیفیت طاری ہونے لگی اور چوبیس سال کی عمر تھی کہ میں نے تبلیغ حق و صداقت شروع کر دی"

اس وقت شاپور ایران کا حکمران تھا، اس لئے مانی نے سب سے پہلے اسی کو مخاطب بنانا مناسب سمجھا۔ شاپور کا بھائی پیروز اس سے قبل اس کا معتقد ہو چکا تھا، اس لئے مانی اسی کے ذریعہ سے شاپور کے دربار تک پہونچا اور وہاں اپنے تئیں پیغمبر ظاہر کر کے اپنی تعلیمات پیش کیں۔

یعقوبی کا بیان ہے کہ جب مانی ابن حماد، شاپور کے دربار میں آیا، تو اسنے زردشتی مذہب کی برائیاں بیان کر کے کہا کہ "نظام کائنات دو قوتوں کے ہاتھ میں ہے، ایک کا قبضہ تاریکی پر ہے جس سے تمام معاصی پیدا ہوتے ہیں اور دوسری قوت روشنی کی مالک ہے جس سے تمام نیکیاں رونما ہوتی ہیں۔" شاپور نے اس کے اصول تسلیم کر لئے اور اپنی رعایا کو مجبور کیا کہ وہ مانوی مذہب اختیار کر لیں۔ اب چونکہ فرمانروائے وقت نے اس کا مذہب اختیار کر لیا تھا، اس لئے اس نے نہایت اہتمام سے اپنے معتقدات

کی تبلیغ شروع کی اور اسی سلسلہ میں اسنے سات کتابیں بھی تصنیف کیں، جن میں۔ چھ سامی زبان میں تھیں اور ایک، شابرقان، قدیم پہلوی زبان میں۔

یعقوبی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ دس سال تک شاپور مانوی مذہب کا معتقد رہ چکا تھا کہ ایک دن کوئی موبد (آتش پرستوں کا مذہبی پیشوا) آیا اور اسے سمجھایا کہ "کیوں تم نے ایک گمراہ شخص کی پیروی اختیار کی۔ اگر تم اسے سچا خیال کرتے ہو" تو میرے سامنے بلاؤ تاکہ میں اس کے کذب کو تم پر اسی وقت ثابت کردوں"۔ چنانچہ مانی طلب کیا گیا اور مباحثہ کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاپور نے پھر مجوسی مذہب اختیار کرلیا اور مانی کے قتل کئے جانے کا حکم دیدیا۔ لیکن مانی کسی تدبیر سے بھاگ گیا اور سیدھا ہندوستان آیا جہاں شاپور کی وفات تک وہ مقیم رہا۔

ابن ندیم نے اپنی مشہور تصنیف فہرست میں اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس کا بیان ہے کہ شاپور کو تلقین مذہب کرکے مانی ہندوستان وغیرہ مشرقی ممالک کی طرف چلا گیا اور اس غیر حاضری کی وجہ سے شاپور اس سے منحرف ہوگیا بہرحال حقیقت جو بھی ہو، یہ بالکل صحیح ہے کہ وہ ایران چھوڑ کر ہندوستان، تبت، اور چین کی طرف چلا گیا اور عرصہ تک بلاد شرقیہ میں پھرتا رہا۔ اسی اثنا میں شاپور مرگیا اور اس کا بیٹا ہرمز تخت نشین ہوا، لیکن ایک سال کے بعد ہی اس کا بھی انتقال ہوگیا اور اس کا بیٹا بہرام سریر آرائے حکومت ہوا، چونکہ یہ ایک عیش پرست نوجوان تھا، اور شب و روز مشاغل لہو ولعب میں مصروف رہتا تھا، اس لئے، معتقدین مانی نے اسے اطلاع دی کہ بادشاہ کو اپنی تفریح سے فرصت نہیں، اس لئے واپسی مناسب معلوم ہوتی ہے۔ یہ خبر سنکر مانی پھر ایران واپس آگیا اور نہایت آزادی سے اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کردی۔

بہرام لاکھ عیش پرست تھا، لیکن ایسا غافل نہ تھا کہ اسے اس عظیم واقعہ کی خبر نہ ہوتی۔ آخرکار اس نے مانی کو اپنے حضور میں طلب کیا اور اس کے اصول مذہب دریافت کئے۔ اس وقت دربار میں بہت سے مجوسی علما موجود تھے، ان میں سے ایک نے کہا کہ "آؤ ہم تم مباہلہ کریں" مانی نے پوچھا "کیونکر" اسنے جواب دیا کہ "سیسہ گرم کرکے ہم دونوں کے بدن پر ڈالا جائے، جو شخص اپنی جان سلامت لے جائے وہی سچا ہے" مانی بولا "یہ کام تاریکی کا ہے، میں اس پر راضی نہیں ہوسکتا"۔ بہرام اس پر بہت برافروختہ ہوا اور سخت ایذائیں دے دیکر اسے ہلاک کرڈالا اور اس کی کھال میں گھاس بھروا کر جُندشاپور (شہر کا نام ہے) ایک دروازہ پر جو اب بھی دروازۂ مانی کے نام سے مشہور ہے لٹکا دیا۔ علاوہ اس کے جہاں جہاں اُس کے ملک میں مانوی

مذہب کے مقلدین موجود تھے، انھیں بھی تلاش کر کر کے قتل کرنا شروع کیا۔

اس وقت تک مانوی مذہب کے متبعین صرف حدودِ ایران کے اندر پائے جاتے تھے، لیکن جب کسریٰ بہرام نے ان لوگوں کے قتل کا حکم دیا تو ان میں سے اکثر دریائے بلخ کو عبور کر کے ماوراء النہر چلے آئے۔ اس کے بعد جب اکاسرۂ عجم پر زوال آیا اور عربوں کی حکومت قائم ہوئی، تو یہ لوگ خلفاء بنی امیہ کے عہد میں ماوراء النہر سے نکل کر عراق میں پھیل گئے۔ جب بنی امیہ کے بعد بنو عباس کی حکومت شروع ہوئی تو ان کی تعداد اس قدر بڑھی ہوئی تھی کہ خلیفہ مہدی (ہارون الرشید کا باپ) کو ایک خاص محکمہ قائم کرنا پڑا، جس کا افسر صاحب الزنادقہ[1] کہلاتا تھا۔ اس کا کام ہی یہ تھا کہ وہ انھیں ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر گرفتار کرے، لیکن پوری طرح ان کا استیصال نہ ہو سکا۔

جب خلیفہ مقتدر کے عہد میں پھر ان کی تلاش ہوئی، تو ان کا ایک گروہ سمرقند چلا گیا اور وہاں اپنے مذہب کی تبلیغ شروع کر دی۔ گورنر خراسان کو یہ خبر معلوم ہوئی تو اس نے انھیں قتل کر دینا چاہا، لیکن خاقانِ چین نے جو مانوی مذہب کا مقلد تھا فوراً یہ پیام گورنر خراسان کے پاس روانہ کیا کہ "تمھارے ملک میں جس قدر میرے مذہب کے پیرو ہیں، اس سے زیادہ مسلمان میرے ملک میں پائے جاتے ہیں، اس لئے اگر تم نے میری ہم مذہب جماعت پر کوئی تشدد کیا تو میں مسلمانوں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں گا"۔ اس صورت میں گورنر خراسان مجبور ہو گیا اور صرف جزیہ عاید کرنے پر کفایت کی گئی۔ اس کے بعد ان کی تعداد کم ہونی شروع ہوئی۔ چنانچہ ابن ندیم کا بیان ہے کہ خلیفہ المطیع کے عہد میں (۳۳۴ھ – ۳۶۳ھ / ۹۴۶ء – ۹۷۴ء) بغداد کے اندر ان کی تعداد صرف تین سو تھی اور ابن ندیم کے زمانہ میں (۳۷۲ھ / ۹۸۲ء) یہ پانچ سے بھی کم تھے۔ البتہ نواحِ سمرقند وغیرہ میں کچھ نفوس پائے جاتے تھے جو عام طور سے اجاری کہلاتے تھے۔

مانوی مذہب کے مقلدین پانچ درجوں میں منقسم تھے:—

---

[1] زنادقہ جمع ہے زندیق کی۔ لفظ زندیق کے متعلق محققین کا اختلاف ہے کہ اس کی حقیقت و اصلیت کیا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ اصل میں زندیک تھا۔ پہلوی زبان میں زندیک مقلدِ زند کو کہتے ہیں۔ چونکہ مانوی مذہب کے لوگ بھی مجوسیوں کی طرح دو خدا کے قائل تھے، اس لئے عربوں نے انھیں بھی زندیق کہنا شروع کیا۔ بعض نے لفظ زندیق کی تحقیق یہ بیان کی ہے کہ مانوی مذہب میں ایک گروہ صدیقین کہلاتا تھا اور قدیم ارمی زبان میں اس لفظ کو صدیقیٔ کہتے تھے۔ فارسی میں زندقی ہو گیا جو بعد کو عام طور سے ہر ملحد کے لئے استعمال ہونے لگا۔

(۱) مُعلّمون (تعلیم دینے والے)۔
(۲) مشمسون (آفتاب کی روشنی سے منور)۔
(۳) قسیسون (تلاش کرنے والے)
(۴) صدّیقون (راست باز)
(۵) سمّاعون (سننے والے)

اِن لوگوں کو سخت تاکید تھی کہ بت پرستی، چوری، جھوٹ، قتل و غارت، حرص و طمع، مکر و فریب سے احتراز کریں۔ یہ لوگ دن میں چار سے سات بار تک نماز ادا کرتے تھے اور ہر مہینہ میں سات دن روزہ کے لئے مقرر تھے۔

مانی نے اپنی تمام تصانیف ایک خاص خط میں تحریر کرائی تھیں جو اسی کا ایجاد کیا ہوا تھا۔ بیانِ جاحظ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے تمام کتابیں اسی خط میں نہایت سفید کاغذ پر روشن سیاہی سے لکھوائی تھیں چونکہ اُس عہد میں کتابوں کو اس قدر خوشخط لکھنے کا رواج نہ تھا، اس لئے لوگوں نے مانی کو مصور خیال کرنا شروع کیا اور یہ خیال رفتہ رفتہ اس حد تک ترقی کر گیا کہ بعد کو ایک کتاب ارژنگ اس کے نام سے منسوب کی گئی، جس کے متعلق خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں صرف تصویریں ہی تصویریں تھیں، درانحالیکہ اسکی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

چونکہ زمانۂ مابعد میں فارسی شعراء نے اسی خیال کو اپنے کلام سے ظاہر کیا اور وہی روایت اُردو میں منتقل ہوگئی، اس لئے آج مانی کا مفہوم صرف مصور رہ گیا ہے اور کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ وہ اپنے عہد کا پیغمبر تھا گو کاذب و باطل ہی سہی۔ !

اندر پرستش

(اثر :- پور داؤد ایرانی)

یکے گیتی یکے یزداں پرستد — یکے پیدا یکے پنہاں پرستد
یکے بودا و آں دیگر برہمن — دگر زاں موسیٔ چوپاں پرستد
یکے از روئے دستورِ اوستا — فروغ و خاور رخشاں پرستد
یکے ذاتِ مسیحِ ناصری را — بسانِ حضرتِ سبحاں پرستد
گروہے پیروِ دستورِ تازی — حدیث و سنت و قرآں پرستد
پرستد بابیٔ الواح و بیاں را — بہائی اقدس و ایقاں پرستد
فقیہِ آزمند از حرص و شہوت — گہے حور و گہے غلماں پرستد
چہ نیرنگ است یاراں مفتیِ شرع — مرید ابلہ و ناداں پرستد
تہی انبان زاہد از زر و مال — قصور و کوثر و رضواں پرستد
چگویم خود تو دانی واعظِ شہر — انین و دیدۂ گریاں پرستد
فرو شد عارف اندر وحدتِ ذات — وجوب و جوہر و امکاں پرستد
صفا جو صوفیٔ پشمینہ پوشاک — مرید و مرشد و عرفاں پرستد
دل از دنیائے فانی کندہ درویش — چو جغدے گوشۂ ویراں پرستد
قلندر والہ از سرِّ اناالحق — حشیش و حدت و قلیاں پرستد
شیدہ روزگار عاشق از عشق — سوادِ طرۂ جاناں پرستد
سرشک از بس فرو بارید شد کور — ہنوز او نرگسِ چشماں پرستد
تو خود دانی کہ مست بادہ خوارہ — کباب و پستۂ خنداں پرستد
نہنگِ قلزمِ اندیشہ شاعر — گزاف و یاوہ و ہذیاں پرستد
فغان از سر دبیرِ روزنامہ — دروغ و مہمل و بہتاں پرستد
وکیلِ محترم راکیش بہ پست — وزیرِ محتشم عنواں پرستد

پزشک آمد عدوے تندرستی — جذام و سکتہ و یرقاں پرستد
منجم سر گم اندر سیرِ افلاک — نجوم و اخترِ گرداں پرستد
دلِ پر آرزوعے کیمیاگر — زر پاکیزہ و رخشاں پرستد
نهد در کورہ بوتہ در دمدم — پس آنگہ ز بیق لرزاں پرستد
نماند کیشِ جادوگر نهفتہ — ملول از آدم و پریاں پرستد
شنیدستی کہ رامشگر ہمہ عمر — نوا و نغمہ و الحاں پرستد
چمیدہ چوں کماں پشت کشاورز — فشاندہ دانہ و باراں پرستد
نہ بیند باغباں جز کشتۂ خویش — از آں رو لالہ و ریحاں پرستد
ندانم از چہ رو غمر زندِ ایران — گہ اطریش و گہے المان پرستد
شناسم جمعے از مردان آزاد — در ایراں کُند و زنداں پرستد
حذر ز آئینِ خرسِ روسی خو — جفا و کینہ و عدواں پرستد
چرا منتے ز شاگرداں پاریس — دل و دیں دادہ و نسواں پرستد
بروں کردہ ز دل مہرِ وطن را — دو زلف و قامتِ خوباں پرستد
اگر پرسی ز کیشِ پور داؤد — جوان پارسی ایراں پرستد

کاوش

میں جب اپنی تقریر میں کسی نکتہ حکمت کی توضیح کرتا ہوں، تو لوگ متحیر رہ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر میرا تبحر علمی اتنا وسیع نہ ہوتا تو رازِ عالم ایک مدتِ مدید تک بےحجاب نہ ہوسکتا۔ میں جب کسی مضمون میں فلاسفۂ قدیم کی لغزشوں کی طرف اشارہ کرتا ہوں تو فاضلینِ زمانہ اعتراف کرتے ہیں کہ میرے مضموں سے انکا علم ایک طویل جست کے ساتھ آگے بڑھ گیا ہے۔ فلکیات کی نئی معلومات پیش کرتا ہوں تو عالم حیران ہو جاتا ہے، کہربائیات کے رازہائے سربستہ کا انکشاف کرتا ہوں تو دنیا بھر کے اخبارات میری توصیف میں متفق نظر آتے ہیں۔ میرے سوانح عمری مرتب کرنے کی صدہا درخواستیں آتی ہیں، میری تصویر کے ہزاروں نقش شائع کئے جاتے ہیں، اور میرے کتب خانہ کی وسعت پر حیرت و استعجاب کی کوئی انتہا نہیں رہتی — مگر، میں حیران ہوں ایک سوال کے حل کرنے میں۔ میں نے اپنی لائبریری کی تمام کتابوں کا بغور مطالعہ کیا، ماہرین علم و فلسفہ، محققین حکمت و ادب سے، جو میرے پاس بغرض استفادہ آتے ہیں، سوال کیا، مگر نہ تو کسی کتاب نے مجھے مطمئن کیا اور نہ کسی عالم نے میرے سوال کا جواب دیا کہ:—

"مجھے اس لوئی عشوہ پرداز کے ساتھ محبت کیوں ہوئی؟"

امام

صحرا کا موتی

صبح کے آثار نمودار ہو چلے تھے، یعنی کائنات گریبان کھولکر آہستہ آہستہ اپنا سینہ عریاں کر رہی تھی۔ دریائے نیل کی موجیں ہلکی ہلکی نسیم کے ساتھ (جسے ندیمِ صباح کہہ سکتے ہیں) مضطرب تھیں، یعنی فطرت چادرِ آب کے کونے کو جنبش دے دے کر مصروفِ تماشا تھی۔ آسمان کی محراب یہ معلوم ہوتا تھا کہ آج اس کا خم بہت دُور بلندی سے شروع ہوا ہے اور زرین ریگستان کے اُفق سے لے کر نیلمی آسمان کے عمق تک، اُن سپید بادلوں کے سوا کوئی چیز حائل نہ تھی، جو سوڈان اور بالائی حصۂ مصر کی فضا میں ہمیشہ اضافۂ حُسن کرتے رہتے ہیں۔ یہ تھی صبح اور ایسی صبح جس کو دیکھکر ایک شخص بے اختیار کہہ سکتا تھا کہ:-

"یہ دُنیا ہے ہر نوع رہنے کے قابل"

آفتاب کی گرم و طلائی شعاعیں فضا کو زرکار بنا رہی تھیں اور سطحِ آب کو رنگین۔ مختلف قسم کے طائر سیاہ و سپید، سبز و سرخ، ارغوانی و قرمزی اپنے بازوؤں کے پورے اضطراب و طپش کے ساتھ ساحل پر آ آ کر گر رہے تھے، معلوم ہوتا تھا کہ کوئی سبکدست نقاش صفحۂ کاغذ پر جلدی جلدی پھول بنا کر چھوڑتا جاتا ہے۔ عین یہی وقت تھا کہ دریا میں ایک کشتی نمودار ہوئی اور موجوں کو قطع کرتی ہوئی ساحلِ بحر کی طرف بڑھنے لگی۔ ایک سپید طائر نے اپنی گردن اُٹھا کر اک آواز دی اور قدرت کی اس اچھوتی خلوت گاہ میں صنعت انسانی کی مداخلت پر اظہارِ نفرت کرتا ہوا اُڑ گیا۔ دوسرے طائروں نے بھی یہ آواز سُنی اور کشتی کو دیکھا، لیکن اس سے قبل کہ وہ کوئی فیصلہ اپنے رہنے یا اُڑ جانے کا کریں، کشتی ساحل تک آگئی۔ اور ایک سوڈانی لڑکے نے جو اپنے حُسن کے لحاظ سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی نے آبنوس میں اڈونس کا مجسمہ تیار کیا ہے اپنے خوبصورت ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کشتی نشین سے کہا "وہ ہے اُمدرم"

اِس کشتی پر ایک نوجوان ترک تھا جو سیاحت کی غرض سے یہ سفر کر رہا تھا، اس کا لباس بالکل مغربی وضع کا تھا اور ریگستان کی دھوپ سے چہرے کو محفوظ رکھنے کے لئے اِس قسم کی ٹوپی سر پر رکھے ہوئے تھا جسے ہم انگریزی ٹوپی کہہ سکتے ہیں۔

امدرم، ایک ریگستانی گاؤں تھا۔ جس میں سوڈانیوں کی غریب و مفلس آبادی اپنے چھوٹے چھوٹے پست مکانات میں زندگی بسر کرتی تھی، نہ یہاں کوئی کھجور کا درخت تھا نہ چشمہ، نہ کوئی باغ اور تفریح گاہ، لیکن پھر بھی وہ صحرائی دلکشی جو ریگستان مصر کے ہر ہر ذرہ میں پائی جاتی تھی، اس میں بدرجۂ اتم موجود تھی، اور اسی کا ذوق سیاحوں کو اِس طرف کھینچ لاتا تھا۔ اور یہی وہ مقام ہے جہاں مہدی سوڈانی کا مقبرہ بھی تھا۔

لڑکے نے کہا۔ "مجھے اجازت دیجئے کیونکہ مجھے پھر واپس جانا اور دوسرے لوگوں کو لانا ہے۔"

خالد۔ لیکن میرا کیمرہ کیونکر جائیگا اور میں وہاں تک کیسے پہونچ سکوں گا۔ میں تو راستہ سے بالکل ناواقف ہوں۔

لڑکے نے تھوڑی دیر تک خاموش رہ کر کچھ سوچا، اور پھر بولا "اچھا سامان مجھے دیجئے میں اس کو اپنے گھر کی طرف لے چلوں گا۔ اور وہاں پہونچکر اپنی بہن کو آپ کے ساتھ کردوں گا۔"

یہ سنکر سیاح نے کسی قدر تامل کیا۔ گویا اُس نے سوچا کہ کیا وہی کرنا چاہیئے جو لڑکا کہتا ہے اور پھر کسی خیال سے مسرور ہو کر بولا "اچھا مجھے اپنے گھر لے چلو"۔ اور دل میں کہنے لگا اگر وہ بہن اسی بھائی کی ہے تو میری نقاشی و مصوری کا بہترین موضوع ہو سکتی ہے۔

(۲)

ہرلا اپنے جھونپڑے کے سامنے دروازہ پر کھڑی ہوئی دریا کی طرف دیکھ رہی تھی اور آفتاب کی شعاع سے جو براہ راست اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی، تابشِ حسن کچھ اور نمایاں ہوتی جاتی تھی۔ اس کی عمر سترہ سال کی تھی اور وہ شباب جو اس عمر کی مشرقی لڑکیوں میں اپنے پورے عروج پر پہونچ جاتا ہے اس کے ہر ہر عضو سے ٹپکا پڑتا

تھا، اس کا چھریرا اور نازک جسم اس قدر سڈول اور خوبصورت تھا کہ اگر کوئی بت ساز چاہتا تو اس سے حسن تناسب کا استعارہ کرکے کسی مجسمہ میں جان ڈال سکتا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ کشیدہ قامتی صحرائی لڑکیوں کا عام حسن ہے، لیکن مرلا کے جسم میں کچھ اور بھی ایسی بات تھی جس نے اس کو اسی طرح ممتاز کردیا تھا جیسے ہرنوں کے گلے میں کوئی سب سے زیادہ وحشی ہرنی، یا سانپوں میں سب سے زیادہ نازک و لچیلی ناگن۔ اس کی پیشانی بلند تھی اور ابرو تلوار کی نوک تک پوری طور سے خمیدہ۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں وہ وحشت تھی جو بڑھ کر سحر ہوسکتی ہے اور ان میں وہ مستی تھی جسے عطر شباب سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ اس کی لانبی لانبی گھنی پلکیں جو پوری طرح جدا ہوجانے کے بعد بھی ایک دوسری سے ملی ہی رہتی تھیں جب بڑی بڑی آنکھوں سے اپنے نقاب کو ہٹا لیتی تھیں، تو معلوم ہوتا تھا کہ ایک موج مے تھی جو سر سے گذر گئی، ایک پھانس تھی جو دل میں چبھ گئی یا ایک سیلاب افسوں تھا جو دیکھنے والے کے ہوش و حواس کو اپنے ساتھ بہا کر لے گیا۔ خوبصورت چمکیلے بال جو بے شمار چھلوں کی صورت میں منتشر تھے، شانہ و دوش پر پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی گردن وہ حسین گردن جو تمام آرائش و زیبائش سے بے نیاز ایک مستقل فوارۂ حسن تھی اس وقت عریاں تھی اور چھوٹے چھوٹے سفید دانت، معلوم ہوتا تھا کہ فطرت نے فرطِ مسرت سے اس کے منہ میں موتی بھر دئے ہیں۔ غرض یہ کہ مرلا قدرت کی بہترین صناعی اور فطرت کا اختراع فائقہ تھی۔ لیکن باوجود اس کے وہ یہ نہ جانتی تھی کہ حسن اور حسن کا مفہوم کیا ہے۔ وہ اک پھول تھی، وہ پھول جو جنگل کی کسی جھاڑی میں کھلتا ہے، وہ ایک کنول تھی، ایسا کنول جو سطح آب پر تنہا ہچکولے کھاتا ہے۔ گاؤں کی اور عورتیں آئینہ دیکھ دیکھ کر سنورا کرتی تھیں، لیکن وہ کبھی اس طرف متوجہ بھی نہ ہوتی تھی۔ اس کی ہجولی لڑکیاں بلوری موتیوں کا ہار پہنکر گھنٹوں یہ دیکھتیں کہ وہ ہر سانس کے ساتھ اُن کے سینہ پر کس طرح جنبش کھاتا ہے، لیکن مرلا کی حسین گردن، اس مصنوعی آرائش سے مستغنی تھی۔ وہ اس سادگی کے عالم میں بھی اک قیامت تھی عریاں، ایک فتنہ تھی بے نقاب اور ایک

نوید عشق تھی، بالکل کھلا ہوا۔

مرلا اپنے حسن سے بے خبر، مرلا ایک مجسمہ تھی عصمت و عفت کا، حیا و شرافت کا، ایک تمثال تھی خود داری و غیرت کی۔ اس میں حسن تھا لیکن بے پرواہ، اس میں شباب تھا لیکن پُر استغنا۔ وہ غریب تھی لیکن دولتِ حسن سے مالا مال، وہ وحشی تھی مگر اس قسم کی جو لاکھوں مہذب و شائستہ دلوں کو تباہ کر دے سکتی تھی۔

اس کا بہترین مشغلہ یہ تھا کہ رات کو اپنے جھونپڑے سے نکلتی اور ایک جگہ بیٹھ کر صحرا کی سنسان تاریکی میں ستاروں کو دیکھتی اور اس سے گھبرا جاتی تو اُس دف کی آواز سننے لگتی جو گانوں میں دُور کسی جگہ بجا کرتا تھا۔ جب کبھی مزدوری کرتی تو سب سے پہلے اجرت میں جو کچھ مِل جاتا اسے گھر کی ضروریات فراہم کرنے میں اپنی ماں کی مدد کرتی اور اس سے بھی بچ رہتا تو پھر اونٹ کا چارہ خریدتی۔ آج بھی وہ اپنے دروازے پر اسی ضرورت سے کھڑی تھی اور اک خاموش حالتِ مسرت میں دریا کی روانی کو دیکھ رہی تھی کہ اس کا بھائی آتا ہوا نظر آیا۔ مسرت اُس کے چہرہ پر دوڑ گئی، اس کے رنگ میں خون کی وہ سُرخی کچھ اور زیادہ نظر آنے لگی جس پر اس کے شباب کی رنگینیاں قایم تھیں۔ اُس نے اپنے بھائی کے ساتھ ایک اجنبی کو دیکھا۔ مگر اسی طرح معصومانہ انداز سے کھڑی رہی۔ بھائی نے کہا "مرلا بکس لے جا اور انھیں کریری تک پہونچا دے، مجھے جلدی واپس جانا ہے۔" مرلا یہ سُنکر جھونپڑے کے اندر گئی اور فوراً واپس آکر تُرک نوجوان سے مخاطب ہو کر بولی۔ "چلئے میری ماں نے اجازت دیدی ہے۔"

اس وقت اُس کی آنکھوں میں اک خاص کیفیت پیدا تھی، چہرے پر ایک رنگ تھا اور رنگ میں تبسم، اس کی آمادگی میں ایک سرور تھا اور سرور میں کچھ بے خبری، اُس نے تصویر کشی کا بکس اُٹھانا چاہا، لیکن خالد نے اُسے خود اٹھالیا اور مرلا کو صرف تپائی دیدی۔

آفتاب بلند ہو چکا تھا، لوگ کھیتوں کے اندر اپنے اپنے کاموں میں مصروف

تھے اور مرلا خاموشی کے ساتھ خالد کے پہلو میں سایہ کی طرح چلی جارہی تھی۔ جب گاؤں کی حد سے دونوں دُور نکل گئے تو خالد جو ریگستان میں اِس طرح پیدل چلنے کا عادی نہ تھا، اپنے اندر اضمحلال محسوس کرنے لگا۔ اُس کا جوتہ ریت میں دھنس دھنس جاتا تھا اِس لئے ایک طرف تو اِس کے لئے قدم اُٹھانا مشکل ہوگیا اور دوسری طرف دھوپ کی شدت نے اُس کے تمام کپڑے پسینہ میں تر کردئے۔ مرلا، خالد کی اِس تکلیف کو دیکھہ رہی تھی لیکن وہ یہ نہ سمجھ سکتی تھی کہ تکلیف کیوں ہے۔ وہ تکلیف جس کے اسباب بظاہر موجود تھے، اس کے نزدیک ایسی نہ تھی جس سے ایک شخص مضمحل ہوسکتا، وہ سوچ رہی تھی اور چاہتی تھی کہ اپنی فراست سے تکلیف کی نوعیت معلوم کرلے۔ اِس غرض سے جب اُس نے خالد کی طرف دیکھا تو اِس کی نظر خالد کی کلائی پر پڑی، جو گرمی کی شدت سے سُرخ ہوگئی تھی۔ مرلا نے سمجھا کہ شاید خون نکل آیا ہے اور تکلیفُ اضمحلال کا سبب یہی ہے۔ اِس لئے وہ فوراً اپنے سپید ململ کے نقاب سے ایک دھجّی پھاڑ کر کلائی میں باندھ دینے کے لئے آمادہ ہوگئی اور یہ کہتے ہوئے کہ "اِسے کلائی میں باندھ لیجئے ورنہ آپ کو اور زیادہ تکلیف ہوگی" خود ہی لپیٹ بھی دی۔

خالد نے کہا "تم نے اپنا نقاب میرے لئے کیوں خراب کردیا" مرلا نے اِس کا کوئی جواب نہیں دیا، اور اس حصۂ صحرا کی گذشتہ تاریخ بیان کرنے لگی۔ خالد سُنتا جا رہا تھا، اور خاموش تھا۔ جب کچھ اور آگے بڑھ گیا تو اُسے ایک سفید چٹان ملی۔ اب تو اِس کے قدم دفعتہً رُک گئے اور وہ یہ کہہ کر بیٹھ گیا "مرلا میں بہت تھک گیا ہوں کچھ دیر بیٹھ جاؤ" مرلا نے فوراً تعمیل حکم کی اور اُس کے سامنے خاموش بیٹھ گئی، اُس کے رخسار کا ایک حصہ ہتھیلی پر تھا اور ریت پر اپنی نازک انگلیوں سے کچھ نشانات بنارہی تھی۔ پندرہ منٹ اسی حال میں گذر گئے تو خالد بولا۔ "مرلا، تم اجازت دوگی کہ میں تمھاری تصویر کھینچ لوں"؟

مرلا۔ یہ تو ہمارے دستور و رواج کے خلاف ہے۔
خالد۔ لیکن کیا میری خاطر سے بھی تمھیں منظور نہیں ؟
مرلا۔ بے شک مجھے آپ کی خاطر اپنے دستور و رواج سے زیادہ عزیز ہے۔
خالد نے تصویر لے لی اور جب اطمینان سے بیٹھا تو کہنے لگا۔
"مرلا تمھیں معلوم ہے تم کس قدر حسین ہو"
مرلا۔ حسین! وہ اونٹ جو آپ نے بازار میں بیٹھا ہوا دیکھا تھا اور تھدی کا وہ سپید مقبرہ بے شک حسین ہے۔
خالد۔ مگر تم تو اس اونٹ اور مقبرہ دونوں سے زیادہ حسین ہو، اور ہاں میرے متعلق تمھارا کیا خیال ہے۔
مرلا۔ آپ تو اس آفتاب کی طرح ہیں جو صبح کو اس میدان میں نکلتا ہے یا اس چاند کے مانند جو شام کو نیلگوں آسمان پر نظر آتا ہے۔
یہ کہنے کے بعد مرلا خاموش ہوگئی اور اس کے کُرتے کے نیچے محسوس ہونے لگا کہ سانس معمول سے زیادہ سریع ہوگئی ہے، اس کی آنکھوں میں کچھ گرمی پیدا ہونے لگی اور آواز میں رعشہ۔ دل میں ایک جوش تھا جس سے وہ شاخ بید کی طرح تھرتھر کانپ رہی تھی۔ یہ دیکھ کر خالد بھی خاموش ہوگیا اور اس کے رنگ کی سُرخی سے ظاہر ہونے لگا کہ اب وہ کچھ بولنا نہیں چاہتی۔

(۳)

آج اس گانؤں میں بازار بھی تھا اور اس لئے ایک شور و ہنگامہ جو ایسے اجتماع کی خصوصیت ہے، برپا تھا۔ آدمیوں کا ہجوم تھا اور قرب و جوار کے لوگ اپنی ضروریات کی چیزیں خریدنے کے لئے جمع ہو رہے تھے۔ اسی میدان کے ایک کونے میں ایک ارغوانی قالین بچھا ہوا تھا، آس پاس اونٹ کھڑے تھے اور قالین پر ایک آدمی بیٹھا ہوا تھا جو اپنی وضع سے خوش حال سوداگر معلوم ہوتا تھا۔ اس کا لباس بھی اچھا تھا اور اونٹ بھی مضبوط و توانا۔ اس کے سامنے ایک غریب

ناتواں ضعیف آدمی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ سوداگر بولا۔
"یہ صحیح ہے کہ تمھاری مرلا، صحرا کا موتی ہے لیکن تم یہ تو خیال کرو کہ ایک نوجوان اونٹ سے تم روزانہ کتنا کما سکتے ہو اور چند دن میں کیسے دولت مند بن جاؤ گے"؟
سننے والے کی سیاہ آنکھیں یہ الفاظ سُن کر چمکنے لگیں، وہ کچھ سوچکر بولا۔
"یہ تو صحیح ہے۔ لیکن میری لڑکی تو اتنا نہیں کھاتی جتنا یہ اونٹ کھائے گا اور پھر لوگوں کو روزانہ اونٹ کی ضرورت بھی نہیں ہوتی"۔
سوداگر۔ "چونکہ میں تمھیں برہم نہیں کرنا چاہتا اس لئے میں تم کو اونٹ کے ساتھ ایک چاقو بھی دوں گا اور یہ قالین بھی"۔
یہ کہکر سوداگر نے چاقو اپنی کمر سے نکالا اور ضعیف سوڈانی کے سامنے رکھ دیا اس نے چاقو کو دیکھا اور کہا "اگرچہ یہ چاقو معمولی ہے لیکن خیر میں معاملہ کر لوں گا۔ جب آپ واپس جائیں گے تو لڑکی آپ کے گھر پہونچا دی جائے گی"۔
سوداگر۔ "میں ابھی گھر تو واپس نہ جاؤں گا کیونکہ مجھے اور سفر کرنا ہے لیکن جس دن چاند پورا ہوگا اس دن پھر یہاں آؤں گا۔ اور مرلا کو ساتھ لے جاؤنگا دیکھو کرنو اب مجھے مایوس نہ کرنا"۔ کرنو نے کہا "نہیں اب ایسا نہیں ہوسکتا" اس نے اونٹ کی نکیل ہاتھ میں لی، چاقو کمر میں رکھا اور قالین بغل میں دبا کر گھر روانہ ہوگیا۔
آسمان کا رنگ قرمزی ہو چلا تھا اور دریائے نیل کی لہریں طلائی سے ارغوانی کہ صحرا کی طرف سے خالد اور مرلا ساحل پر پھر واپس آئے تا کہ ایک دوسرے سے جدا ہوں۔
خالد۔ مرلا اب تم مجھے اجازت دو۔ میں اپنا سفر پھر شروع کروں گا۔
مرلا نے اپنی مسترحم نگاہیں اٹھائیں اور کہا "آفتاب سیاہ چٹانوں کو روزروشن

کر دیتا ہے لیکن پھر غروب ہو کر ان کا سارا رنگ ، ساری مسرت چھین لیتا ہے
پھر کیا اس وقت کوئی بہتر یہ توقع کر سکتا ہے کہ وہ سورج کو غروب ہونے سے روک
لیگا، اور اپنی روشنی کو باقی رکھ سکے گا؟ آپ جائیے۔"
خالد- لیکن اگر میں نہ جاؤں اور چاہوں کہ کوئی ایک چاندنی رات اس وسیع
خلوت میں بسر کروں اس طرح کہ میں ہوں اور تم، تو تم سمجھتی ہو کہ میں
پھر بھی زندہ رہ سکوں گا؟
مرلا- میری سمجھ میں نہیں آیا کہ آپ کیا کہتے ہیں - آپ زندہ نہ رہیں گے۔ کیوں؟
خالد- اگر کسی پھول کو یہ خبر ہو کہ اس کی نکہت ایک دماغ کو معطر کر سکتی
ہے، اس کی نزاکت کے تخیّل سے ایک قلب پاش پاش ہو سکتا ہے، اس
کے رنگ میں وہ اثراتِ حُسن پنہاں ہیں، جن سے بہار کی ساری دلربائیاں قایم
ہیں تو میں تم کو بھی بتادوں کہ تمھاری اک نگاہ، ایک مستغنی نظر، میرے ساتھ وہ
کچھ کر سکتی ہے جو تیر و خنجر سینہ کے ساتھ کرتے ہیں میرے بدن میں لرزہ
ہے، میری روح میں ارتعاش- میرے جسم میں کپکپی ہے، میرے اعضا میں
تھرتھراہٹ- لیکن تمھیں کیا خبر کہ یہ سب کیوں ہے اور کس لئے۔"
مرلا- لیکن اگر میری نگاہوں سے آپ کو تکلیف ہوتی ہے تو میں ان کو ہٹا لونگی
میں آپ کے پاس تنہائی میں کوئی چاندنی رات نہ بسر کروں گی - اس دریا کے
کنارے جب شام ہو جائے گی، میں کبھی آپ کے پاس نہ بیٹھی رہوں گی - جب
آپ کی روح میں لرزش محسوس ہونے لگے گی، جب میں دیکھوں گی کہ ساحل
پر اب کوئی نہیں رہا اور سارے کشتیبان اپنے اپنے گھر چلے گئے تو میں خود بھی
چلی جاؤں گی۔

(۴)

راستہ پُرسکون تھا- چاند پورا چاند افق سے نکل چکا تھا، خالد، مرلا کے ساتھ
دریائے نیل کی سیر کر رہا تھا اور سوچتا جاتا تھا کہ اس کی زندگی جو اب سے پہلے بالکل

آزاد و خود مختار تھی آج پابند و گرفتار ہے اور دُنیا کے تمام تعلقات سے گھری ہوئی۔ وہ اپنے دل سے کہہ رہا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مرلا انسان ہے یا دیوی، اور میں اسکا فیصلہ کرنے سے قاصر ہوں۔ مرلا بھی خاموش تھی شاید اس کے دل میں بھی ایسے ہی خیالات کا مد و جزر ہو رہا تھا۔ دونوں کبھی کبھی ایک دوسرے کی صورت دیکھتے اور پھر حجاب و انفعال کی پوری حیرت سامانیوں کے ساتھ اپنی نگاہیں نیچی کر لیتے۔ فطرت کا یہ دلفریب منظر، ساحل کی یہ اچھوتی فضا، گویا ان دونوں کی جولان گاہ خیال تھی، جس میں یہ دونوں اپنی اپنی جگہ تخیّل کی اُلجھنوں میں مبتلا تھے۔ وہ اس آغاز کو دیکھ کر انجام پر کوئی حکم لگانا چاہتے تھے، وہ اس ابتدا کے سہارے سے انتہا کا کوئی راز دریافت کر لینے میں مصروف تھے۔ لیکن باوجود اس کے اُن کا ہر خیال، تصادمِ نظر کے بعد روح میں بالیدگی پیدا کرنے کے بجائے اضمحلال پیدا کر دیتا تھا۔ ان میں سے ہر ایک اپنے واردات دل بیان کرنے سے عاجز تھا۔ البتہ آنسوؤں کے ذریعہ سے نکل پڑنے والا الم کبھی کبھی اِن کی ساری کیفیت ظاہر کر دیتا تھا۔ وہ کبھی مسکرا بھی دیتے، لیکن یہ مسکرانا بھی تردد سے خالی نہ ہوتا تھا۔ جب بہت دیر اسی حال میں گذر گئی تو مرلا نے کہا "آج تو آپ بہت افسردہ و مضمحل نظر آتے ہیں۔"

خالد۔ ہاں، میں یہ سوچ رہا ہوں کہ میری محبت مجھے کہاں لئے جا رہی ہے۔

مرلا۔ آپ اِس کی فکر ناحق کرتے ہیں قسمت پر چھوڑ دیجئے وہ مستقبل کے ہر لمحہ کی نسبت اپنا فیصلہ مستحکم رکھتی ہے۔

خالد۔ مگر قسمت پر چھوڑ دینا بھی تو آسان نہیں۔

مرلا۔ تو زیادہ آسان یہ ہے کہ آپ واپسی کا عزم کر لیجئے وطن پہونچکر یہ خیالات رفع ہو سکیں گے۔

خالد۔ اور تم؟

مرلا۔ مجھے یہیں کہیں دفن ہو جانے دیجئے۔

خالد۔ آخر تمھیں میرے ساتھ چلنے میں کیا عذر ہے۔

مرلا۔ یہ ناممکن ہے۔ وہ ذرے جو رات بھر چاند کی ضیاء میں جگمگایا کرتے ہیں صبح کو اسکا ساتھ نہیں دے سکتے۔

خالد۔ تو میں چلا جاؤں، اس پر تم راضی ہو؟

مرلا۔ ہاں راضی ہوں۔ اس لئے کہ آپ کے چلے جانے کے بعد موت مجھے کچھ کم سکون نہ پہونچائے گی، خاص کر اس حالت میں کہ آپ کی محبت میری روح سے جدا نہیں ہو سکتی

رات کا حصہ زیادہ گذر گیا تھا اور خالد کو دریا عبور کرکے خرطوم اپنے جاے قیام پر پہونچنا تھا، اس لئے وہ پھر ملنے کا وعدہ کرکے رخصت ہوگیا۔ مرلا کچھ دیر تک کھڑی رہی اور جب خالد نظروں سے اوجھل ہوگیا تو اس نے بھی اپنے گھر جانے کا قصد کیا۔ وہ جانے والی ہی تھی کہ اس نے دیکھا کہ خالد اپنا کوٹ بھول گیا ہے۔ اس نے چاہا کہ دوڑ کر دیدے لیکن پھر یہ خیال کرکے کہ کل دیدوں گی اپنے بازو پر ڈال لیا۔ اب رات زیادہ جا چکی تھی۔ اس لئے وہ جلدی جلدی گھر کی طرف آئی۔ اس کا جھونپڑا روشن تھا اور اندر سے کچھ آوازیں آ رہی تھیں۔

تم مجھ سے ایک اونٹ، چاقو اور قالین لے چکے ہو، لیکن ابتک مرلا کو تم نے میرے پاس نہیں بھیجا۔ اور بھیجتے کیسے۔ شاید تم کو خود خبر نہیں کہ مرلا کہاں ہے۔ وہ ایک اجنبی کے ساتھ نیل کے کنارے باتوں میں مصروف ہے اور اب مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ تم تو میرا چاقو اور قالین میرے حوالے کرو اونٹ میں خود کھول لونگا۔

کرنو نے یہ سنتے ہی ایک چیخ ماری اور چاقو نکالکر فوراً ایک پتھر پر تیز کرنے لگا۔

مرلا کا خون خشک ہوگیا، اس کے قلب کی حرکت بند ہونے لگی اس وجہ سے نہیں کہ وہ بدنام اور رسوا ہوئی، بلکہ اس لئے کہ خالد اگر راستہ میں مل گیا تو وہ ضرور ہلاک کر دیا جائیگا۔ اس لئے وہ فوراً جھونپڑے کے دوسرے حصہ میں گئی جہاں اس کا بھائی سو رہا تھا اور اسے جگا کر بولی "تو ابھی دریا کی طرف جا راستہ میں تجھے ایک اجنبی سیاح ملیگا اس سے کہدینا کہ اب ادھر وہ کبھی نہ آئے کیونکہ لوگ اسے ہلاک کر دینا چاہتے ہیں۔"

بھائی کو روانہ کرکے وہ دروازے سے باہر نکلی ہی تھی کہ اس کا باپ بھی دوسرے دروازے سے نکلا اور اندھیرے میں دیکھنے لگا کہ اُسے کس طرف جانا چاہیئے۔ مرلا نے سمجھا کہ غالباً خالد کو اطلاع ہونے سے قبل اس کا باپ ساحل تک پہونچ جائے گا۔ اس لئے اُسی لمحہ میں کچھ سوچکر اس نے خالد کے کوٹ کو اپنے جسم پر ڈال لیا اور قصداً جھونپڑے کی پشت سے جاکر ادھر کھڑی ہوگئی جدھر سے اس کا باپ گذرتا۔ وہ ابھی وہاں پہونچی ہی تھی کہ اس کا باپ ہاتھ میں کھُلا ہوا چاقو لئے ہوئے اِس طرف سے گذرا اور یہ اس کو دیکھ کر اس طرح بھاگی کہ اُسے یقین ہوجائے، وہ اجنبی یہی ہے، جس کی اُسے تلاش ہے۔ چنانچہ کرتو نے کوٹ کو دیکھ کر یہی یقین کیا اور اُس کے پیچھے دوڑا۔ مرلا نے بھی ایک ناکمل سعی اپنی جان بچانے میں کی۔ کبھی ادھر بھاگی، کبھی اُدھر مُڑ گئی، لیکن آخر کو کرتو نے اُسے پا لیا۔ اور عین اُس وقت جبکہ وہ آگے کو بھاگ رہی تھی اس نے چاقو کی ایک ایسی ضرب پہونچائی کہ دستہ تک شانہ کے نیچے تیر گیا۔ او. مرلا ایک کراہ کے ساتھ منہ کے بل گر پڑی۔

کرتو اب مطمئن تھا۔ اس لئے کہ اُس کا انتقام پورا ہوچکا تھا اور اسی لئے اُس نے اس سے قبل کہ اجنبی کی صورت دیکھنے کی کوشش کرے ادھر اُدھر ٹہلنا شروع کیا تاکہ تنفس ٹھیک ہو جائے۔ مگر جب اس نے اپنا چاقو نکالنے کے لئے لاش کو اپنی طرف کھینچا اور اُس کا چہرہ چاندنی میں دیکھا تو اُسے معلوم ہوا کہ یہ تو "صحرا کا موتی ہے"!

نقوشِ مآنی

(اثر:۔ مولوی سید کلب احمد مآنی جائسی)

مآنی صاحب کی وہ خصوصیت شعری، جس نے ان میں اک ممتاز حیثیت پیدا کردی ہے، اُن کے کلام کی صفائی اور روانی ہے۔ ممکن ہے کہ وہ غزل بغیر کسی کاوش کے کہدینے پر قادر ہوں، لیکن اُن کا ہر ہر شعر بتاتا ہے کہ جو کچھ انہوں نے لکھا ہے بہت سوچ سمجھ کر اور بہت غور و تامل کے بعد، یہی وجہ ہے کہ انکا کلام اسقام و اغلاط سے پاک ہوتا ہے۔

علاوہ اسکے ایک بات اور بھی ہے جو کم از کم مجھ پر بہت اثر ڈالتی ہے اور وہ یہ کہ اُن کی شاعری یکسر جذبات نگاری ہوتی ہے اور صنائع کیلئے وہ اپنے رنگِ تغزل کو خراب نہیں کرتے۔ (اڈیٹر)

تجسس ہو تو ملجاتا ہے سب کچھ دارِ امکاں میں
کوئی لمحہ خوشی کا "آؤ" ڈھونڈھیں عمرِ انساں میں

چراغ اک انکی محفل میں ہی، اک میری شبستاں میں
یہاں تصویرِ مایوسی ہے، رونق بزمِ جاناں میں

جنوں کی یادگار اک آشیانہ ہے گلستاں میں
عبث تنکے چنے تھے میں نے کیا فصلِ بہاراں میں؟

نہ ہوتا عشق سے مضطر، تو کیا دلکو سکوں ہوتا!
سکوں کا ذکر ہی کیا، سایۂ گردونِ دوراں میں

کھُلے ہیں پر، کھلا ہے در، مگر کب جب خزاں آئی
میں کہتا ہوں قفس میں مر رہوں اب یا گلستاں میں!

میں لیتا رخصتِ یک نالہ، اور خاموش ہو جاتا
قفس اک بار اگر صیاد رکھ دیتا گلستاں میں

کبھی طرح دل آزاری تھی، لیکن ابتو اے مآنی
ادائے جاں نوازی دیکھتا ہوں دردِ ہجراں میں

مآنی جائسی

بہار کی دیوی

(اثر:- نیاز فتحپوری)

تمنا زا تھیں کیفیاتِ صبحِ صحنِ بستانی
فضا میں منتشر تھے نشہ ہائے بادِ بارانی

ابھی تک ارغوانی تھی افق کی شعلہ سامانی
نہ تھا خورشید کا چہرہ ہنوز آگاہِ عریانی

تھی بلبل شاخِ گل پر، اور شبنم گل کے دامن میں
تھی ہر شے خلوت آسودۂ غرض اپنے نشیمن میں

صباحت جلوہ گر تھی، اور اسمیں اک ترنم تھا
فضا خاموش تھی، اور اسمیں پنہاں اک تکلم تھا

جدھر دیکھو، ادھر امواجِ نکہت میں تلاطم تھا
زمیں تا آسماں گویا تبسم ہی تبسم تھا

وہ رنگِ صبح اور وہ اہتزازِ نور کا عالم
تھیں گویا مجتمع رعنائی و دوشیزگی باہم

یہ تھی موسم کی حالت اور اسکی لطف فرمائی
کہ ناگہ ایک لڑکی صحنِ گلشن میں نظر آئی

وہ رنگت اسکی، جسکو دیکھکر بڑھ جائے بینائی
وہ رخ اسکا فدا جسپر دو عالم جلوہ آرائی

یونہی رفتار اسکی، اک اضافہ تھا قیامت میں
لچک جانیکی پھر وہ اک ادائے خاص قامت میں

تھے ڈورے آنکھ کے یا موجِ صہبا جامِ کوثر میں
تھی پتلی یا دلھن کوئی سیہ اطلس کی چادر میں

نویدِ عشق تھا پنہاں نگاہِ کیف پرور میں
مژہ کہدیتے ہم اسکو لچک ہوتی جو نشتر میں

مسیحا کی زبان، اسکی نگہ اعجاز پرور تھی
خموشی اسکی گویا نطقِ عیسیٰ کے برابر تھی

۱؎ ایڈیٹر سے خط و کتابت کا پتہ۔ نور محل بھوپال ہے۔

تھا اُسکے جسمِ دوشیزہ میں کچھ کیفِ جوانی بھی لئے تھی یعنی مینا میں شرابِ ارغوانی بھی
تھا اسکے حُسن کی سبزی میں رنگِ زعفرانی بھی تھی ساری اسکی یعنی کُندنی بھی اور دھانی بھی

وہ چل پڑتی تو ہر ذرہ جگہ سے اپنی ٹل جاتا
ٹھہر جاتی تو گویا نظمِ عالم پھر سنبھل جاتا

میں کہتا جسم کو الماس، اگر اسمیں لچک ہوتی سمجھتا زلف کو عنبر، اگر اسمیں چمک ہوتی
میں کہتا پھول کو عارض، اگر اُسمیں یہ نک ہوتی دہن کو شعلہ کہدیتا، اگر اسمیں مہک ہوتی

کہاں کافور میں وہ ضو کہ اسکا رنگ ہو جائے
جب اسکے رُخ کے آگے آئینہ بھی زنگ ہو جائے

سُنہرے بال بھی تھے جا بجا کچھ اُسکے گیسو میں کرن جیسے اُلجھ کر رہ گئی ہو حلقۂ مُو میں
تھا عکسِ زلفِ پُرخم اس جبینِ آئنہ خو میں پڑی لہرا رہی تھی یا کوئی ناگن کسی جُو میں

کہوں کیا جاذبیت کسقدر تھی اسکے سینے میں
مگر بھر دی گئی تھیں بجلیاں اس آبگینے میں

دمِ رفتار وہ اس کی ادائے دلربا یا نہ ہوا سے سروِ زریں کا تھا گویا سو لچک کھانا
قدم اسکا اُٹھانا تھا کمر میں بل کا پڑ جانا وہی بل ناگنوں نے جس سے سیکھا ایسا لہرانا

خرامِ ناز تھا اُس کا کہ تصویرِ نزاکت تھی
سلاست آب کی تھی یا نمودِ موجِ نکہت تھی

اُسے بلبل نے دیکھا اور گلِ رنگین قبا سمجھا اُسے قمری نے دیکھا اور سروِ دلکشا سمجھا
پتنگوں نے اسے اک شعلۂ ظلمت ربا سمجھا کسی نے مہر جانا اور کسی نے آئنہ سمجھا

مگر میں نے تو اذکارِ ازل کا معجزہ جانا
اُسے فطرت کا یعنی اختراعِ فائقہ جانا

وہ تمکین حُسن میں، جو کیکپا دے بادشاہوں کو
ادا وہ تیکھی، جو مجبوب کردے کجکلاہوں کو
وہ چتون جو کرے پامال کسریٰ کی نگاہوں کو
وہ دیوتیت، کہ کردے محو عالم سے گناہوں کو

اُلٹ دے وہ زمیں کو ایک ابرو کے اشارے سے
وہ چاہے تو سمندر دُور ہٹ جائے کنارے سے

نیاز

ایک غلطی کا ازالہ

علی گڈھ میگزین کی (جولائی تا اکتوبر) اشاعت میں ایک تنقیدی مضمون شائع ہوا ہے، جو خصوصیت کے ساتھ حضرت سُہا کی شرح دیوانِ غالب (زیر طبع) پر ایک معاندانہ تبصرہ کہا جا سکتا ہے۔

فہرست میں محرر کا نام درج نہیں ہے، لیکن مضمون کے اختتام پر "... فتحپوری از بھوپال" لکھ کر بعد کو محرِّف خطوط سے محو کرنے کی ناکام کوشش کیگئی ہے۔ اسلئے میں اس جگہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ وہ مضمون میرا نہیں تھا۔ رہا یہ امر کہ کیوں آخر مضمون میں یہ عبارت لکھ کر محو کی گئی، اس کے متعلق میں جناب رشید احمد صاحب صدیقی (ایم۔ اے) اڈیٹر علیگڈھ میگزین سے استدعا کروں گا کہ براہ کرم اولین فرصت میں اس مسئلہ پر روشنی ڈالیں اور اپنے رسالہ میں شائع فرماویں۔

اے مطربہ!

(از:۔ سید امتیاز علی تاج، مدیر کہکشاں)

حضرت تاج، ملک کے اُن مخصوص نوجوانوں میں سے ہیں، جنھیں فطرت کی طرف سے نہایت رنگین ذوقِ ادب ملا ہے۔ "مطربہ" سے خطاب کرنے کے ساتھ ہی ساتھ خیال کا سازِ بربط سے ہٹ کر اپنے ہی سازِ ہستی کیطرف منتقل ہوجانا اور موسیقی کی اس حقیقی روح کی جستجو کرنا جو مادی اسباب نغمہ سے بالکل علیحدہ اک چیز ہے، تاج صاحب کی پاکیزگی ذوق کا بیّن ثبوت ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ رنگ ٹگور کی تقلید ہے، مگر میں اس سے بالکل متفق نہیں۔ (اڈیٹر)

تیرے ساز نے میری آواز تو سینہ میں سے کھینچ لی، لیکن، اے مطربہ! میرا دل ابھی تک ویسا ہی وزنی نظر آتا ہے۔ شاید کچھ آواز سے زیادہ باریک، گیت سے زیادہ لطیف چیز میرے سینے میں بے چین ہے۔ میں اسکو کیا کروں؟

کیا تیرے بربط میں کوئی ایسا نازک تار نہیں، جسکی لرزش آواز نہ اختیار کرسکتی ہو؟ جو کرخت آواز بننے سے قبل کی کیفیات کو روشن بنادے؟ کیا واقعی اِس لمحہ کا کوئی راگ نہیں ہے، جب صبح اپنی بند آنکھوں کو کھولنے کی تمنا کرتی ہو یا جب شام کا دامن افق پر اک قرمزی وہم بنجاتا ہو؟

خاموشی میرے لئے بیقراری بنگئی ہے اور ساز کی سامعہ خراش آواز میں اب سکون نہیں رہا، اس لئے سکوت اور آواز کے درمیان کچھ بجا، کوئی ایسی چیز، جو یہ ننھا سا وقفہ مسکرا پڑے، اِس کے اسرار پر سے سیاہ ریشم سرک جائے، تاروں کے باہر کے ہنگامے سو جائیں اور تاروں کے اندر کی خاموشی دھڑکنے لگے، بیقرار ہوجائے۔ اور

برسات کی اِس اُداس شام میں، جو خاموش نغمہ میرے سینہ کا بوجھ بنا ہوا ہے، تیرے تاروں کی تھرتھری اسے نکال لے۔

تاج

جرمنی حرب و تجارت کا ایک عجیب راز

جرمنی کا ایک دعویٰ یہ ہے کہ صنعت و حرفت اور اصول تجارت میں دُنیا کی کوئی سلطنت اُسکا مقابلہ نہیں کرسکتی، اور دوسرا دعویٰ یہ ہے کہ گذشتہ جنگ کو اُس کے دشمنوں نے صرف اس لئے چھیڑا تھا کہ اقتصادی میدان میں جرمنی اُن سے آگے نہ بڑھنے پائے۔

اگر پہلا دعویٰ صحیح ہے تو دوسرا بھی صحیح ہوسکتا ہے اور جرمنی کے سر سے اس عظیم الشان جنگ کی ذمہ داری اُٹھ جاتی ہے، کیونکہ یہ بات کسی طرح سمجھ میں نہیں آسکتی کہ ایک سلطنت جسکا قبضہ تمام تجارتی دُنیا پر ہو وہ خواہ مخواہ جنگ کی مصیبت مول لے، جبکہ اقتصادی فتح، جنگ کی فتح سے زیادہ مفید اور پُرامن ہے۔

جو شخص جرمنی کی اقتصادی حالت پر غور کرکے اُس کے پوشیدہ راز معلوم کرنے کی کوشش کریگا، وہ یقیناً نتیجہ کے لحاظ سے، اُس شخص سے بالکل علیحدہ ہوگا جس نے فقط جرمنی تجارت کے اعداد و شمار پر اکتفا کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جرمنی تجارت کی وسعت قدرتاً دیرپا نہیں ہوسکتی تھی اور اسکی تجارت کے بڑے حصہ کا انجام نقصان ہی تھا۔

یہ بالکل صحیح ہے کہ جرمنی کی تجارت غیر معمولی سرعت سے ترقی کر رہی تھی لیکن اس کے پاس وہ وسائل نہ تھے جن کے ذریعہ سے وہ اپنی مصنوعات آسانی کے ساتھ تمام دُنیا کے بازاروں میں بھیج سکے اور یہی وہ تجارتی خطرہ مستقبل تھا، جس نے بمقابلہ اور سلطنتوں کے جرمنی کو جنگ کی طرف اسقدر جلد مائل کردیا۔

۱۱ مئی ۱۹۱۲ء کو ہر پوسہل نے جو شہر لوبک کا ملک التجار ہے برلن میں ایک لکچر دیا، جس میں بتایا کہ اگر کسی سلطنت سے جرمنی کی جنگ چھڑ جائے، تو جرمنی صنعت و حرفت اور تجارت

پر اُسکا کیا اثر پڑے گا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسئلہ مراکش میں جرمنی اور فرانس کی باہمی کشیدگی نے خطرناک صورت اختیار کرلی تھی، اور دونوں میں جنگ کا امکان یقین کی حد تک پہونچ گیا تھا۔

فاضل خطیب نے بیان کیا "اس میں شک نہیں ہے کہ انگلستان ہماری بحری تجارت کے خلاف جو لڑائی چھیڑنے والا ہے، اُس کے نتائج ہمارے لئے نہایت مضرت رساں ثابت ہونگے، اور ہمیں مجبوراً انگریزی شرائط کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑیگا۔"

اِس کے بعد مقرر نے اپنے دعوے کے ثبوت میں چند اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے کہا کہ "جرمنی تجارت کی درآمد اور برآمد ۹۰۰ ملین پونڈ ہے جس میں ۶۵۰ ملین صرف برطانوی بیڑے کے رحم پر موقوف ہے۔" اس کے بعد اس نے اُن مواد خام اور غلہ کی مقدار بتائی جسے جرمنی اپنی ضروریات کے لئے دوسرے ملکوں سے لاتا ہے، پھر جنگ چھڑ جانے کی صورت میں کارخانوں کے بند ہونے، کام کی کمی اور کاری گروں کی بیکاری سے جو مصیبتیں ملک پر آنے والی ہیں اُن کا ذکر کیا پھر اپنی تقریر کو اس جملہ پر ختم کیا کہ "ہمارا مستقبل انھیں مسائل اقتصادی پر موقوف ہے اور اس لئے ضروری ہے کہ جنگی مصارف کے تخمینہ کے ساتھ ان مسائل کا بھی لحاظ کیا جائے۔"

اِس کی تقریر کا لہجہ اُس خوف کو صاف بتا رہا تھا جو جرمنی کو اُس کے تجارتی اور اقتصادی مستقبل کے متعلق گھیرے ہوئے تھا۔ اِس خطبہ سے پہلے ملک میں بعض تجارتی مصائب رونما بھی ہو چلے تھے۔

مذکورہ بالا دلائل ثابت کرتے ہیں کہ یہ جنگ محض اندرونی مشکلات کو دفع کرنے کے لئے شروع کی گئی تھی۔ لیکن یہ مشکلات کیا ہو سکتے تھے، جب کہ ظاہری حالت کو دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا تھا کہ ملک نہایت خوش حال ہے اور کسی قسم کے اقتصادی یا تجارتی خطرہ کا اُسے خوف نہیں ہے۔ تاریخ نہایت نادر صورتوں میں اس سوال کا جواب دے سکتی ہے۔

لمحۂ تاریخی

۱۸۷۹ء میں بسمارک نے، جنگ کے متعلق ایک قانون تیار کیا اور اصحاب املاک اور مالکان کارخانہ کے مصالح کو متفق کرنے کی اُس نے انتہائی کوشش کی کیونکہ جرمنی کی حکمراں جماعت الٰہی دونوں فریق سے مرکب ہے، لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لینا چاہیئے کہ انھیں رائے کی کثرت سے فائدہ پہونچ سکتا تھا کیونکہ جرمنی ایسی حکومت

نہیں تھی جو راے عامہ کی تابع ہو جاتی۔ چنانچہ آخری انتخابات میں حکمراں طبقہ کے پینتالیس لاکھ ووٹ تھے اور اس کے مقابل آزاد طبقہ کے حصہ میں بہتر لاکھ)۔

۱۸۸۸ء میں غلیوم اول نے وفات پائی اور فریڈرک ثالث اس کی جگہ جانشین ہوا لیکن اس کی صحت نے اُسے چند مہینے سے زیادہ حکومت کا لطف اٹھانے نہیں دیا۔ اس کے بعد غلیوم ثانی مسندِ حکومت پر بیٹھا، اس نے تھوڑے عرصہ کے بعد بسمارک کو منصب مشیریت سے معزول کر دیا اور کا پریفی کو اس کی جگہ مقرر کیا۔ اس نے بھی سیاست میں بسمارک کا طرزِ عمل اختیار کیا۔ لیکن کا پریفی کا طریق کار "مشیر جدید" کے موافق نہ تھا کیونکہ اس نے مزدور پیشہ جماعت کے راستہ میں بہت سی آسانیاں بہم پہونچائیں اور انھیں اندرونی سیاست میں بڑا دخل ہو گیا مزید براں کا پریفی نے اصحاب اراضی اور مالکان کارخانہ کے درمیان مساوات قایم کی۔ ایک مرتبہ اس نے ریشتاغ میں یہ کہا کہ "جرمنی ایک صنعتی ملک ہے" یہ سُنکر جماعت اشراف (aristocracy) اس سے سخت ناخوش ہوئی، یہاں تک کہ بادشاہ کو مجبور ہوکر کئی مرتبہ انھیں تاج قیصری کے ساتھ وفادار رہنے اور امن قایم رکھنے کے لئے خطبے دینے پڑے اور انھیں یقین دلایا کہ میں تم کو ایک روشن مستقبل کی طرف لئے جا رہا ہوں۔

جب نوجوان قیصر نے جرمنی کی عنانِ سلطنت اپنے ہاتھ میں لی، تو جرمنی کا نظامِ اجتماعی اور شیرازۂ قومی پوری طرح مستحکم تھا اور سلطنت کے مختلف عناصر میں قابلِ اعتماد اتفاق اور اتحاد پایا جاتا تھا۔ قیصر نے اپنے دل میں سوچا "اس وقت جبکہ داخلی مشکلات کی طرف سے بالکل اطمینان ہے، مجھے توسیع سلطنت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے اور اپنے ملک کو مالی اور فوجی حیثیت سے تمام دُنیا کے ممالک سے آگے بڑھا دینا چاہیئے"۔ یہ وہ زرّین خواب تھا جس نے قیصر غلیوم کے دل و دماغ کو بھی مشغول کر رکھا تھا اور جب سے وہ تختِ حکومت پر بیٹھا تھا اس کے اقوال اور اعمال میں اسی کی جھلک نظر آتی تھی۔ قیصر اس خواب کو عالم شہود میں لانے کے لئے ہر طرح کوششیں کر رہا تھا اور وہ ملک کو زرخیز بنانے اور آراضی کی قوت نامیہ بڑھانے اور اس کے پوشیدہ خزانوں کو کام میں لانے

نے کے لئے ہر قسم کی عملی تدابیر استعمال کرتا تھا۔ ہر فرد کے طبعی ذوق اور فطری رجحان سے فائدہ اٹھاتا تھا۔ اس نے جدید معادن نکالے، کارخانے جاری کئے، نقل و حرکت کے وسائل درست کئے، تجارت کو وسعت دی، ملک کی آمد و خرچ کا بہترین انتظام کیا۔ چنانچہ ان تدابیر کا نتیجہ یہ ہوا کہ ملکی تجارت کا انحصار صرف جرمنی ممالک پر نہیں رہا بلکہ قریب تھا کہ تمام دنیا پر جرمنی کا اقتصادی اور ادبی قبضہ ہو جائے۔

جرمنی صنعت کی ترقی

مذکورہ بالا وسائل پر عمل پیرا ہونے کے بعد ۱۸۹۰ء سے موجودہ صدی کے اوائل تک جرمنی نے اس قدر حیرت انگیز ترقی کی، جس کی مثال تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ ۱۸۸۶ء میں صرف سات کروڑ بیس لاکھ ٹن کوئلہ جرمنی میں برآمد ہوا تھا، لیکن ۱۹۰۶ء میں اس کی مقدار بائیس کروڑ پچاس لاکھ ٹن تک پہونچ گئی، اور لوہے کے کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کی تعداد چار لاکھ تک بڑھا دی گئی۔

۱۹۰۲ء میں جرمنی میں سولہ ہزار کپڑے کے کارخانے تھے، جن میں نوے لاکھ آدمی کام کرتے تھے۔ اسی پر اور صنعتوں کو قیاس کرنا چاہیئے۔ جرمنی صنعت کی ترقی کا اظہار کرتے ہوئے مختصراً صرف یہ کہہ دینا کافی ہے کہ "جرمنی میں جنگ سے قبل تین لاکھ کارخانے تھے جن میں کروروں مزدور کام کرتے تھے"۔ لیکن صنعت و حرفت کی اس ترقی اور کثرت مصنوعات کے مقابلہ میں جرمنی مال کی مانگ اسقدر نہ تھی اور مصنوع کی تعداد طلب سے بہت زیادہ بڑھ گئی تھی۔

اسوقت جرمنی کو ضرورت محسوس ہوئی کہ مال تجارت کے لئے جدید منافذ پیدا کئے جائیں جس سے تجارت کی اندرونی مشکل حل ہو سکے۔ چنانچہ اس نے اس مقصد کے لئے نوآبادیوں کو وسعت دینی شروع کی، لیکن اسمیں اُسے چنداں کامیابی نہیں ہوئی۔

جرمنی کو نوآبادیوں کی توسیع نہ صرف اس وجہ سے مدّنظر تھی، کہ ملک میں مزدوروں کی کمی تھی بلکہ صرف اقتصادی ضروریات کا بھی اقتضا یہی تھا کیونکہ ایک طرف تو جرمنی کو مواد خام اور غلہ کی ضرورت ہوئی (کیونکہ اب جرمنی بجائے زراعتی ملک ہونے کے تجارتی

اور صنعتی ملک ہوگیا تھا) اور دوسری طرف ذخائر تجارت میں مصنوعات کی کثرت اور برآمد کی کمی نے اُسے جدید منافذ پیدا کر دینے پر مجبور کر دیا۔

جرمنی تجارت کے طریقے

جرمنی نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے جدید طریقے اور نئے اصول اختیار کئے جن کے ذریعہ سے وہ دوسری حکومتوں پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ ان وسائل کا انحصار چار اصول پر تھا۔

۱۔ ہجرت

وسائل مذکورہ میں سب سے مقدم ہجرت ہے لیکن یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ جرمنی جب اپنے وطن کو چھوڑتا ہے تو اپنے جامعۂ جنسی اور رابطۂ قومی کو بھول جاتا ہے بلکہ وہ اس صورت میں اور بھی زیادہ وطنیت کا حامی ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت نہایت ہی نادر ہو گی کہ وہ اہل ملک کے ساتھ مخلوط ہو کر اپنی جنسیت کو فراموش کر دے اور اس سے عجیب تر بات یہ ہے کہ جرمنی جب وطن کو چھوڑ کر کسی ملک میں سکونت اختیار کرتے ہیں تو وہاں بھی متفق ہو کر ایک مرکزی قوت پیدا کر لیتے ہیں، چنانچہ یہی صورت انھوں نے ممالک متحدہ امریکہ میں اختیار کی۔

جرمنی قوم کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ ہر قسم کا پیشہ کرنے کے لئے تیار ہیں کبھی جرمنی آپ کو ہوٹل کا خدمتگار نظر آئے گا، کبھی رئیس شرکت (ڈائرکٹر کمپنی) اور کبھی محرر جریدہ۔ لیکن وہ ہر پیشہ اور ہر صنعت میں جرمنی ہی رہے گا اور اپنی پوری کوشش سے جرمنی زبان اور جرمنی اثر پھیلانے کی کوشش کریگا۔

جنگ سے قبل بلجیم کے تمام مصالح، جرمنی کے ہاتھ میں تھے اور امریکہ جنوبی کی جمہوری حکومتوں کو بھی جرمنی کی طرف سے بڑا خطرہ ہوگیا تھا، کیونکہ انہوں نے مختلف مرکزوں میں اپنا اتفاق قایم کرلیا تھا، اسی طرح سوئٹزرلینڈ میں جرمنی نفوذ بڑھتا جاتا تھا۔

جرمنی، جس ملک میں سکونت اختیار کرتے ہیں وہاں کے منافع کو قبضہ میں لانے کے لئے وہ دو طریقے اختیار کرتے ہیں۔ پہلا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے وکلاء (ایجنٹوں) کے ذریعہ سے جرمنی مال کی اشاعت میں انتہائی کوشش کرتے ہیں اور ہر طریقے سے لوگوں کو اُسکی طرف رغبت دلاتے ہیں اور دوسرا طریقہ یہ ہے کہ جا بجا جرمنی دوکانیں قایم کرتے ہیں اور خود اہل ملک کی

تجارتگاہوں میں شریک ہوجاتے ہیں۔

جرمنی کو اقتباس افکار اور دوسروں کی تقلید میں بھی خاص ملکہ حاصل ہے۔ پیرس میں لباس تیار کرنیکے جسقدر کارخانے اپنے مال کی خوبی کے لحاظ سے مقبول ہیں، جرمنی اُن سب کی نہایت مکمل نقل کرتا ہے۔ یورپ میں اگر کوئی امریکن تاجر کسی چیز کے خریدنے کے لئے آتا ہے تو جرمنی ایجنٹ اس سے جرمنی جانے کے لئے اصرار کرتا ہے اور اپنا مقصد حاصل کرنے کے لئے، اس کو ہر طرح سہولتیں بہم پہونچاتا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ جب امریکن، جرمنی سے فرانس میں واپس آتا ہے تو اُسے یہاں بھی وہی چیزیں نظر آتی ہیں جنھیں وہ جرمنی میں دیکھکر آیا تھا۔ اگر لباس میں کوئی نئی طرز نکلتی ہے تو جرمنی اُس کی اشاعت سے پہلے، ہر ممکن طریقے سے اُس کے حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اپنے ملک میں بھیجدیتا ہے اور وہاں کے لوگ نہایت کثیر مقدار میں اُس لباس کو بناکر سستے داموں بیچتے ہیں، چاہے وہ اپنی عمدگی میں فرانسیسی مال سے کم ہی کیوں نہ ہو۔

۲- مال کو کم قیمت پر بیچنا | یہ اصول، اقتصادی اصطلاح میں "Dumping" کہلاتا ہے اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ مال کو سستا کرکے دوسرے تاجروں کو نقصان پہونچایا جائے اور جب وہ دیکھیں کہ دوسرا تاجر مجبور ہوکر چلا گیا ہے اور اب بازار صرف انھیں کے قبضہ میں رہ گیا ہے تو پھر تدریجاً مال کو چڑھادیں۔ مثلاً ایک ٹن عمارتی لوہا جرمنی میں ۱۳۰ مارک میں ملتا تھا۔ لیکن یہی لوہا سوئیٹزرلینڈ میں ۱۲۰ مارک کو، امریکہ میں ۱۰۳ مارک کو اور اٹلی میں صرف ۷۵ مارک کو بکتا تھا اور یہ سب کچھ جرمنی نے اس لئے کیا تھا کہ اُس کے ملک کا مال مقبول ہوجائے اور دوسرے ملک کے تاجر مقابلہ میں شکست کھاجائیں۔

دوسری قومیں بھی اس طریقہ کا استعمال کرتی ہیں لیکن فرق یہ ہے کہ اور قومیں زیادتی مال کی صورت میں یا اپنی کسی تجارتی مشکل کو رفع کرنے کے لئے ہنگامی طریقے پر اس اصول کو کام میں لاتی ہیں۔ اور جرمنی تو دائمی طور پر اسکا پابند ہے۔

۳- وصولی قیمت میں تاخیر | جرمنی نے اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لئے ایک طریقہ یہ بھی اختیار کیا ہے کہ وصولی قیمت میں تعجیل نہیں کرتا۔ ۶ ماہ سے لیکر ۱۸ ماہ تک

وصولی میں تاخیر کر دیتا ہے بلکہ بعض جرمنی تجارت خانے اُس کے ساتھ وصولی قیمت کی کوئی مدت مقرر نہیں کرتے اور اس کے مقابلہ میں فرانسیسی کارخانہ نہایت نادر صورتوں میں تین یا چار مہینے کی تاخیر گوارا کر سکتا ہے۔

جرمنی نے اس اصول کی بدولت برازیل، ارجنٹا اور مکسیکو کی تجارت گاہوں پر قبضہ کر رکھا تھا۔

۴۔ حکومت کی اعانت | اعانت حکومت کئی طریقے پر ہوتی ہے جس میں سب سے مقدم سیاسی اثر ہے بسمارک کا قول ہے "جرمنی تجارت کے رواج پاتے ہی جرمنی جھنڈا لہرانا چاہیئے"

خود جرمنی حکومت، تجارتی حیثیت رکھتی ہے۔ اکثر ریلیں اور کانیں حکومت کی ملک ہیں۔ ساتھ ہی اسکے حکومت تاجروں کیلئے ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچاتی ہے اور ہر طریقہ سے اُن کی ہمت بڑھاتی ہے۔

یہی وہ طریقے ہیں جن کی بدولت جرمنی تجارت تمام دنیا میں پھیل گئی تھی اور جنگ کے بعد بھی وہ ان ہی طریقوں سے کام لے رہا ہے۔

نیاز

ضعف بصر کا ایک عجیب علاج

بعض لوگوں کو دُور کی چیز صاف نظر نہیں آتی، اسکا سبب اکثر یہ ہوتا ہے کہ آنکھ طبعی حالت سے زیادہ باہر کیجانب اُبھری ہوئی ہوتی ہے۔ اس سے قبل تجربہ سے یہ بات ثابت ہو گئی تھی کہ اگر بعض عضلات آنکھ کے قطع کر دیئے جائیں تو ضعف بصارت بالکل زایل ہو جاتا ہے، لیکن عصر حاضر میں ایک طریقہ علاج دریافت ہوا ہے جو نہایت عجیب و غریب ہے اور جسے ہم "ریاضت چشم" یا "آنکھ کی جمناسٹک" کہہ سکتے ہیں۔ اس طریقہ کا موجد اول تو ڈاکٹر ہرشال ہے، لیکن اسمیں کچھ اصلاح و اضافہ کر کے حال ہی میں ایک ڈاکٹر نے فرانس کی مجلس علوم میں ایک آلہ پیش کیا ہے جسکی صورت عینک سے مشابہ ہے، لیکن بجائے شیشوں کے اسمیں دو حلقے لگے ہوتے ہیں جو ہر وقت آنکھ کو دباتے رہتے ہیں۔ یہ دباؤ حسب خواہش کم زیادہ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک ضعیف شخص پر جو ۱۔ انچ کے فاصلہ سے کتاب نہیں پڑھ سکتا تھا، اسکا تجربہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ چند دن کے بعد ہی اس آلہ کے استعمال سے ۴۰ انچ پر رکھی ہوئی کتاب آسانی سے پڑھنے لگا ہے۔

نیاز

یہ تیری بے ترتیب و بے پرواز زلف، جو تیرے بلورین شانہ پر منتشر ہے، میں سمجھتا ہوں کہ وہ کس استغنا کے ساتھ، مجھے اُن لمحہ ہائے شوخ کی یاد دلا رہی ہے، جنکا تعلق صرف ایک عورت ہی کے مینائے جسم سے ہے۔

تو اِن نغمہ ہائے محبت کو یکجا کرنے کی کوشش نہ کر، کیونکہ گیسو بکھرنے ہی کیلئے جمع ہوتے ہیں، بگڑنے ہی کیلئے سنورتے ہیں۔

میرا دل اس "دامگاہِ عشق" یعنی تیری زلفِ محبت پناہ کا دائمی اسیر و نخچیر ہو کر رہ گیا ہے اور تیری زرین زلف کا ہر خم سحر آگیں، جس میں اک "خلقتِ روشن" پنہاں ہے، میرے "عنق روح" میں زنجیر کی خدمت انجام دے رہا ہے، لیکن وہ زنجیر جو مجھے عالم نور میں ادھر سے اُدھر آزاد لئے پھر رہی ہے۔

اے حسنِ حزین، اے تاجدارِ گیسوئے زریں، تجھے معلوم ہونا چاہیئے کہ میرے "شبہائے عشق" کے جذبات تیری ہی پُر اہتزاز زلفوں کے ساتھ وابستہ ہیں اور میری صبح تسلی انھیں کی راتوں میں پنہاں ہیں۔

جب کبھی وہ میرے چہرہ پر پریشان ہو جاتے ہیں اور میں مسرور ہو کر انھیں چومتا ہوں، تو ایسا محسوس کرتا ہوں کہ میری "بہار حیات" کا راز ان ہی میں آسودہ ہے۔

جب تیرے پُر وفا بال شب محن میں میرے سر پر بکھر جاتے ہیں، تو میں تیرے پہلو میں لیٹا ہوا اپنے آنسو اُن میں پروتا رہتا ہوں۔ آہ، میں اس گیسوئے "تسلیت کار" اس عطر روح پرور کو کیونکر بھول سکتا ہوں۔

اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ تیری زلفِ "زرتار" میرا کفن ہو سکتی ہے، تو میں اسی وقت مذہب پروانہ قبول کرنے کے لئے آمادہ ہوں۔

یہ تیرے پُر محبت، اور دل میں "کیفیت سکران" پیدا کر دینے والے بال، جسقدر میرے محزون سر پر پریشان ہوتے ہیں، اسی قدر میرے نقوشِ تمنا اُبھرتے جاتے ہیں۔

آ، اور اپنے گیسو کے معطر، منور اور ریشمی رومال سے میرے شامہ کو مست اور میری روح کو لرزاں بنا جا۔

نیاز

(ماخوذ از ترکی)

معلومات

(حرکت زمین کا مشاہدۂ عینی)

تقریباً ایک ربع صدی سے زاید زمانہ ہوا جب فرانس کے ایک حکیم نے اپنے تجربہ سے حرکت زمین کے مسئلہ کو مشاہدات عینی میں داخل کردیا تھا اور اب امریکہ کے ایک فیلسوف لیونارڈ ایبٹسن نے ایکدوسری ترکیب سے جو بہت زیادہ آسان ہے، گردش ارض کو براے العین ثابت کر کے دکھایا۔

ہم یہاں دونوں کے تجربات نہایت صاف و واضح الفاظ میں بیان کرتے ہیں، تاکہ ہر شخص اپر عمل کر کے اپنی زمین کے چکر کو دیکھ سکے۔ لیکن فرانسیسی حکیم لیول آیون کا تجربہ سمجھنے سے پہلے مسئلہ حرکت نے ایک خاص نکتہ کو سمجھ لینا ضروری ہے، اسلئے ہم پہلے اسکو بتادینا چاہتے ہیں۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ گھڑی (کلاک) میں ایک لنگر ہر وقت ادہر سے اُدھر جنبش کھایا کرتا ہے، جسے انگریزی میں پنڈولم (Pendulum) کہتے ہیں۔ اسکو یا ہر ایسی وزنی چیز کو جو کسی تار یا دھاگہ میں باندھ کر لٹکادی جائے عربی میں رقاص کہتے ہیں اور جس خط یا سطح پر وہ جنبش کرتا رہتا ہے اسکا نام سطح ترقص یا سطح اہتزاز ہے۔ یہ مسلمہ مسئلہ ہے کہ ایک رقاص کی سطح ترقص کبھی نہیں بدلتی، یعنی جس سمت میں وہ جھول رہا ہے، ہمیشہ ایک ہی ہوگی۔ مثلاً ایک رقاص کی سطح ترقص کسی دیوار کے متوازی ہے، تو وہ ایسی ہی رہیگی۔ اگر تم رقاص کو دائرہ کی صورت میں گردش دوگے، تو بھی وہ تھوڑی دیر کے بعد دیوار کے متوازی ہوکر جھولنے لگے گا۔

اب غور کیجیے کہ اس مسئلہ کو پیش نظر رکھکر فرانسیسی حکیم نے کیونکر حرکت زمین کا مشاہدہ کرلیا۔ وہ کہتا ہے کہ "سیسے یا لوہے کی ایک وزنی گولی لیکر فولاد کے تار میں لٹکادو اور اُس تار کو چھت میں کسی کڑے سے لٹکا کر جھٹکا دو، تاکہ وہ آزادی سے اِدھر اُدھر جھولنے لگے۔ اِس رقاص کے نیچے ایک میز رکھو اور اسپر ایک دائرہ کھریا مٹی یا کوئلہ سے بناؤ۔ اسکے بعد دائرہ کے محیط پر صفر اور ۱۸۰ درجہ کے درمیان خط ملادو۔ جب یہ کرچکو تو دائرہ پر ریت بچھادو اور سیسے کی گولی میں ایک سوئی یا درجہ نما لگادو تاکہ جھولنے کے وقت جب رقاص اس دائرہ پر سے ہوکر گذرے تو سوئی ایک باریک خط بناتی چلی جائے۔ ایک گھنٹہ کے بعد تمکو معلوم ہوگا کہ گولی کی سمت

رکت بدلی اور ریت پر ایک زاویہ بنانے لگی، لیکن چونکہ یہ مسلّم ہے کہ گولی اپنی سطح ترقص نہیں بدل سکتی، اسلئے ظاہر ہے کہ میز نے گردش کی اور میز کی یہ گردش گردش زمین کی وجہ سے وقوع میں آئی۔ جہاں یہ تجربہ ہو رہا تھا، وہاں پروفیسر ڈیوار نے نہایت تیز برقی روشنی کر دی تھی، جس سے رقاص کی سمت حرکت میں خفیف سی تبدیلی بھی نظر آتی تھی اور ایک ایک منٹ میں یہ معلوم ہونے لگا کہ سارا کرہ حرکت کر رہا ہے۔ خطِ استوا پر جو مقامات ہیں، وہاں یہ اثر نمایاں نہیں ہوسکتا، البتہ جہاں کا عرض البلد ۳۰ درجہ ہے (جیسے ملتان، ڈیرہ دون وغیرہ) وہاں یہ سوئی ۲۴ گھنٹہ میں نصف دائرہ ختم کرلے گی اور قطبین پر پورا دائرہ۔

دوسرا تجربہ لیونارڈ بیسٹن کا ہے، جو اس سے زیادہ آسان ہے۔ کسی کرہ میں جہاں دھمک کا اثر نہ پہونچے، اور آبادی سے ذرا علیحدہ ہو، ایک بڑا گہرا پیالہ یا ٹب، جسکا قطر کم ازکم ایک فٹ کا ہو، فرش پر رکھکر قریب قریب پانی سے بھردو اور چند گھنٹوں کیلئے اُسے اپنے حال پر چھوڑ دو۔ اسکے بعد نہایت باریک پسی ہوئی رال پانی پر آہستگی سے اسطرح چھڑکدو کہ پانی کی سطح پر اسکی ایک تہ جمکر تیرنے لگے۔ پھر باریک پسا ہوا کوئلہ لیکر پیالہ کے مرکز سے محیط تک اسطرح چھڑکو کہ ایک خطِ مستقیم بنجائے اور اسی سلسلہ میں پیالہ کے کنارہ پر بھی ایک نمایاں خط کوئلہ کے سفوف سے بنادو۔ چند گھنٹے کے بعد تم دیکھو گے کہ پانی کی سطح پر جو لکیر کوئلہ کی تھی اسنے اپنی جگہ بدل دی ہے، یعنی اس سیاہ لکیر سے علیحدہ ہوگئی ہے، جو پیالہ کے کنارہ پر اسی کے سلسلہ میں بنائی گئی تھی۔ اسکا سبب یہ ہوا کہ پیالہ کے اندر کا پانی تو اپنے حال پر قایم رہا اور پیالہ نے مغرب سے مشرق کی طرف زمین کے ساتھ پوری گردش کرلی اور اسطرح اسکے کنارہ کی لکیر پانی کی لکیر سے علیحدہ ہوگئی۔

ہوا کے قطرے

یہ فخر امریکہ کے ایک فرزند چارلس ٹریلر کو حاصل ہے کہ اسنے ہوا کو پانی کی طرح رقیق بنا کر دُنیائے سائنس کو حیرت میں ڈالدیا اور مادی عالم میں غیر معمولی آسانیاں تجارت وصنعت وغیرہ کے متعلق پیدا کر دیں۔ بظاہر یہ غیر ممکن سا معلوم ہوتا ہے کہ ہوا کیونکر پانی کیطرح رقیق ہوسکتی ہے، لیکن سائنس کے نزدیک جو ہر رقیق چیز کو جامد اور ہر جامد کو رقیق بنا سکتی ہے، یہ کوئی مشکل بات نہ تھی کہ وہ ہوائے لطیف کو بھی اسطرح بہا کر دکھا دے۔ یہ سب کرشمے ہیں حرارت اور دباؤ کے۔

اس سے پہلے بھی بہت حکما اس امر کی کوشش میں مصروف تھے اور ۱۸۹۵ء میں مقتہ کو اس حد تک

حل کر چکے تھے کہ کسی گیس (دخانی چیز) کو اگر دباکر مختصر کر دیا جائے، تو اسکا درجہ حرارت بڑھ جاتا ہے۔ بعد کو مزید
تجربہ سے معلوم ہوا کہ درجہ حرارت کا بڑھ جانا بالکل عارضی محض دباؤ کی وجہ سے ہوتا ہے اور خود گیس میں
کوئی کیفیت مزید حرارت کی نہیں پیدا ہوتی۔ اسکے بعد یہ انکشاف ہوا کہ اگر گیس اسیطرح انضغاط (دباؤ)
کی حالتیں سرد کر لیجائے اور پھر اپنی اصلی حالت تک پھیلنے کیلئے چھوڑ دیجائے تو اسکا درجہ حرارت بہت کم
ہو جاتا ہے۔

آخرکار ۱۸۷۷ء میں ایک شخص راول پکٹیٹ نے آکسیجن گیس کو دباؤ کے ذریعہ سے بہت سرد کر دیا اور بمشکل
تمام چند قطرے ہوا کے حاصل ہو سکے جو فوراً ہی بلبلوں کی شکل میں تبدیل ہو کر ہوا میں مل گئے۔
۱۸۹۲ء میں نائٹروجن پر یہی تجربہ کیا گیا اور کوئی مزید فائدہ مترتب نہو سکا۔ اسی زمانہ میں انگلستان کے
ایک پروفیسر ڈیوار نے یہی تجربہ شروع کیا اور رقیق ہوا کی تھوڑی سی مقدار وہ حاصل کر سکا جو پانی ملے ہوئے برف
کیطرح تھی۔ اس کامیابی نے بہت سے حکما کو اسطرف متوجہ کر لیا، لیکن مشکل یہ تھی کہ ہوا کو رقیق کرنے میں مصارف
بہت ہو جاتے تھے اور انکی نسبت سے بہت کم ہوا پانی بنتی تھی۔ لیکن اب ٹریلر نے جو طریقہ ایجاد کیا ہے
اس سے بیس سنٹ (تقریباً آٹھ آنے) میں ایک گیلن رقیق ہوا طیار ہو جاتی ہے اور اسکی وجہ یہ ہے کہ اسنے خود
رقیق ہوا کی قوت سے اور زیادہ مقدار کی رقیق ہوا بنانے میں مدد لی یعنی جسقدر حصہ ہوا کا رقیق ہوتا جاتا ہے
اسکو وہ اور ہوا کے رقیق کرنے میں صرف کرتا ہے۔

ٹریلر کی تجربہ گاہ میں علاوہ انجن کے ایک آلہ ہوا کو دابنے والا ہے اور ایک حوض ۵ فٹ گہرا جسمیں بہت
سے چھوٹے چھوٹے پائپ (نل) دوڑا دیئے ہیں۔ ان نلوں کے اوپر نمدہ وغیرہ لپیٹ دیا گیا ہے تاکہ حرارت
سے متاثر نہوں۔ ان نلوں کی ترتیب اسنے اسطرح رکھی ہے کہ پھیلنے والی ہوا جو ٹھنڈی ہوتی جاتی ہے
ان نلوں کے قریب سے ہو کر گذرتی ہے، جنمیں رقیق بنائی جانیوالی ہوا بھری ہوتی ہے۔ ہوا پر جو دباؤ ڈالا جاتا
ہے اسکا اوسط فی مربع انچ ۲۵۰۰ پونڈ ہوتا ہے۔ نلوں کے اندر جو ہوا بھری رہتی ہے، وہ نلوں کے اندر
سے جسوقت گذرتی ہے تو وہ تقریباً ۵۰ درجہ تک سرد ہو جاتی ہے (یہ نل پانی کے اندر پڑے رہتے ہیں
تاکہ اندر بھری ہوئی ہوا پر خارجی حرارت کا اثر نہ ہو۔)

یہاں سے یہ ہوا دو مختلف نلوں کے ذریعہ سے (جنمیں سے ایک کے اندر رقیق ہوا رہتی ہے اور دوسرے
میں رقیق بنانیوالی ہوا) پھر ہوا کے خزانہ میں پہونچتی ہے اور پھر یہاں سے مزید دباؤ کے ساتھ انھیں نلوں میں

جاتی ہے۔ یہ عمل مسلسل پندرہ منٹ تک ہوتا رہتا ہے۔ اسکے بعد آخری نل کا منہ کھولدیا جاتا ہے جس سے رقیق ہوا دھار کیطرح گرنے لگتی ہے، اس ہوا کا درجۂ حرارت صفر سے ۳۱۲ درجہ نیچا ہوتا ہے۔

یہ رقیق ہوا پھیلنے کیلئے اسقدر بیتاب ہوتی ہے، کہ اگر اُسے کسی بند برتن میں مقید کردیں تو فوراً توڑ کر باہر نکلجائے اسلئے اس رقیق ہوا کو محفوظ رکھنے کیلئے مختلف ترکیبیں عمل میں لائی جاتی ہیں۔ انمیں سے ایک ترکیب یہ ہے کہ یہ رقیق ہوا ایک قمقمہ میں رکھی جاتی ہے، جسپر اور ایک خول شیشہ کا ہوتا ہے، ان دونوں شیشوں کی گردن اوپر جاکر ایک ہوجاتی ہے۔ دونوں شیشوں کے درمیان جو خلا ہوتا ہے اس سے یہ فائدہ ہے کہ حرارت کا اثر دیر میں ہوتا ہے اور اندرونی قمقمہ میں جو ہوا بھری ہوئی ہے وہ دیر تک قایم رہتی ہے۔ اس ترکیب سے جو رقیق ہوا ادھر سے اُدھر منتقل کیجاتی ہے، وہ نو گھنٹہ کے اندر صرف ایک ثلث کے قریب کم ہوتی ہے۔

رقیق ہوا بہ نسبت معمولی ہوا کے بارہ گنا زیادہ قوی ہے، لیکن باوجود اسکے وہ ایک معمولی بکس کے اندر رکھکر منتقل کیجا سکتی ہے۔ پھر چونکہ ہوائی جہازرانوں کو ایسی ہی چیز کی ضرورت ہے جو باوجود ہلکی ہونے کے بہت زیادہ قوی ہو، سمندر میں غوطہ لگانے والے اور آبدوز کشتیوں میں سفر کرنیوالے بھی پانی کے اندر سانس لینے کی غرض سے یہی چاہتے ہیں کہ کم سے کم جگہ میں کثیر مقدار ہوا کی وہ ساتھ لیجا سکیں۔ اسلئے پروفیسر ٹریلر کی یہ اختراع جسقدر مفید ثابت ہوسکتی ہے، ظاہر ہے۔

رقیق ہوا کی مدد سے ایک گلاب کا پھول، ایک انڈا کانچ کیطرح جمکر ٹھوس ہوسکتا ہے اور پارہ اس حد تک منجمد ہوسکتا ہے کہ اسمیں آہنی کیل بھی مشکل سے جاسکے۔ علاوہ اسکے لوہے کی سلاخیں جب اسمیں غوطہ دیکر باہر نکالی جاتی ہیں تو مشعل کیطرح جلنے لگتی ہیں۔

بہرحال وہ وقت دور نہیں، جب اس رقیق ہوا سے ایندھن، اور گیس کے انجنوں کیلئے کوئلہ کا کام لیاجائے گا۔ وہی ہوا ہوگی جو ایک جہاز کے انجن کو بھی چلائیگی، جہازوالوں کیلئے روشنی بھی مہیا کریگی اور رات کو انکے بند کمروں میں قابل تنفس چیز ہوکر چاروں طرف گردش بھی کیا کرے گی۔

فوارۂ نور (Search Light)

گذشتہ جنگ کی تاریخ میں، جہاں اور مختلف اختراعات حربیہ کا ذکر کیا جائیگا، وہیں نمایاں طور سے فوارۂ نور کے کارناموں پر بھی روشنی ڈالی جائے گی، جس نے جارحانہ و مدافعانہ خطوط جنگ پر

فریقین کو بہت مدد پہونچائی۔

یہ روشنی کیسی ہے اور اسکی قوتِ تنویر کس بلا کی ہے، اسکا اندازہ ایک انگریزی خاتون کے اس فقرہ سے ہو سکتا ہے کہ "جب میں صلیبِ احمر کی جمعیت کے ساتھ میدانِ جنگ میں پہونچی اور رات کو جرمنی کی فوج نے ہمارے کیمپ کا صحیح جائے وقوع معلوم کرنے کی غرض سے اپنا فوارۂ نور اسطرف ڈالا، تو میں اس تیز اور سورج سے زیادہ قوی روشنی کو دیکھکر ایسا محسوس کرنے لگی کہ شاید اسوقت دُنیا کا کوئی راز پوشیدہ نہیں رہ سکتا"

یہ روشنی صرف جنگ ہی کے مواقع پر کام نہیں آتی، بلکہ تجارتی جہازوں کے لئے بھی از بس کار آمد ہے۔ جسطرح جنگ کے وقت اس سے یہ کام لیا جاتا ہے کہ رات کو دشمن کی کمیں گاہ اور تارپیڈو کشتیوں کی نقل و حرکت معلوم کیجائے، اسی طرح جہازوں میں یہ روشنی اطلاع دینے کیلئے، راستہ معلوم کرنے کیلئے اور کسی تباہ شدہ جہاز کے آدمیوں کو بچانے کی غرض سے بھی استعمال ہوتی ہے۔

علاوہ اسکے یہی روشنی اُن میناروں پر بھی ہوتی ہے جو جابجا سمندر کے اندر جہازوں کو خطرۂ تصادم سے بچانے کیلئے قایم کئے جاتے ہیں۔ بڑے بڑے شہروں میں آگ بجھانے والی جماعت بھی عظیم الشان عمارتوں کے اندر اسی روشنی سے کام لیکر معلوم کرتی ہے کہ اُسے کہاں کہاں جانا چاہیئے۔

یہ روشنی بڑے بڑے محدب شیشوں اور عکس افگن آئینوں کی مدد سے پیدا کیجاتی ہے اور وقتِ واحد میں لاکھوں برقی بلبوں کی روشنی ایک نقطۂ ضیا سے حاصل ہو سکتی ہے۔

اس آلہ کی شکل بڑے بیلون کیطرح ہوتی ہے۔ جہاں سے روشنی نفوذ کرکے باہر جاتی ہے وہیں روشنی کے محاذ میں بڑے بڑے محدب شیشے لگے ہوتے ہیں اور انکے پیچھے عکس افگن آئینے ہوتے ہیں جو روشنی کو ایک مرکز کے اندر سے باہر کیجانب پھینکتے ہیں۔

اس آلۂ تنویر سے جو شعاعیں نکلتی ہیں وہ اسقدر باہم ملی ہوئی ہوتی ہیں کہ تقریباً ایک میل تک فوارۂ نور کی چوڑائی ۵۰ فٹ سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اسکے بعد وہ اور زیادہ پھیلتی ہے۔

تمام ممالک میں آلۂ تنویر طیار کئے گئے ہیں، لیکن قوی ترین آلہ وہ تھا جو ۱۸۹۳ء کی نمایش چکاگو میں پیش کیا گیا تھا۔ یہ آلہ اب کلیفورنیا کے رصدگاہ میں نصب کر دیا گیا ہے۔ اسکی قوت تیس لاکھ برقی لمپوں کی ہے اور ۱۵۰ میل تک رات کو دن بنا دیتا ہے۔ اسکے محدب شیشے کا وزن ۸۰۰ پونڈ (تقریباً دس من)

ہے اور کل آلہ کا وزن ۲۰۰ پونڈ (تقریباً ۵، ۷ من)

خود نقل کر لینے والا آلہ کاتبہ

عصر حاضر کی تعجب خیز اختراعات میں سے ایک آلہ کاتبہ ہے جو بالکل موجودہ ٹائپ رائٹر کیطرح ہوتا ہے فرق صرف یہ ہے کہ اسمیں ایک برقی آنکھ لگی رہتی ہے، جسکے ذریعہ سے ہر تحریر کی نقل خود بخود ہو جاتی ہے اس آلہ کا موجد مسٹر فنکیور نامی ایک برقی مہندس ہے، مہندس مذکور نے آلہ کی بالائی سطح پر ایک برقی آنکھ لگائی ہے، جو آلہ کے اُس جزو کے ساتھ حرکت کرتی جاتی ہے جو کاغذ کو لئے ہوئے سرکتا ہے۔ اس آنکھ کی ساخت نہایت پیچدار اور علم برق کے پُر اسرار اصول پر مبنی ہے، جسکا مفصل بیان یہاں نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ آنکھ نہایت ہی شدید الاحساس ہے اور اسمیں یہ کیفیت عنصر سیلنیم کی مدد سے پیدا کی گئی ہے، جو ۱۸۱۷ء میں دریافت ہوا تھا اس عنصر کا خاصہ یہ ہے کہ وہ روشنی سے بہت جلد اور نہایت شدید تاثر قبول کرتا ہے اور روشنی کی شعاعوں کو اپنے اندر جذب کر کے برقی شعاعوں کی صورت میں تبدیل کر دیتا ہے، جو تار کے ذریعہ سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہو سکتی ہے، اسی مادہ کی مدد سے بذریعہ ٹیلیفون تصویریں منتقل ہوتی ہیں اور برقی آنکھ بنا کر اندھوں کو بینا کیا جاتا ہے۔

موجد نے سیلنیم کے اسی خاصہ پر اپنی اختراع کی بنیاد رکھی ہے، اُس نے عنصر مذکور کی مدد سے ایک کہربائی آنکھ تیار کی ہے جسپر حروف کی صورتوں کا عکس پڑتا ہے، یہ عکس سیلنیم پر اپنا اثر کر کے اُسمیں برقی رو پیدا کرتا ہے، اور یہ برقی موج اسی بٹن کو دباتی ہے جسپر حرف مطلوب لکھا ہوتا ہے بٹن کے دبنے سے حرف کاغذ پر چھپ جاتا ہے اور اسکے چھپتے ہی برقی آنکھ آیندہ حرف کو چھاپنے کیلئے آگے بڑھتی ہے اور جب پوری ایک سطر کی نقل ہو جاتی ہے تو تحریر (جسکی نقل ہو رہی ہے) ایک برقی تار کے ذریعہ سے بمقدار ایک سطر کے اونچی ہو کر آنکھ کے مقابل ہو جاتی ہے اور دوسری سطر نقل ہونے لگتی ہے اور اسی طرح پورا صفحہ ٹائپ ہو جاتا ہے۔

امریکہ کی تعلیمی ترقی

دس سال قبل امریکہ میں فی ہزار ۷۱ لڑکے، دس سال کی عمر تک ناخواندہ رہتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں یہ تعداد صرف ۶۶ رہگئی یعنی اب فیصدی صرف چھ آدمی ایسے ہیں جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے۔

بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اب بھی امریکہ میں نسبتاً جہل زیادہ ہے، لیکن جسوقت اس حقیقت کو بھی اس واقعہ میں شامل کر لیا جائیگا کہ اس حساب میں امریکہ کی تمام وہ آبادی شامل ہے جو ملکی و اجنبی وحشی و متمدن سیاہ و سپید کہلاتی ہے تو یقیناً سخت حیرت ہوگی کہ جزائر امریکہ کے تمام وحشی، اجنبی اور حبشی بھی اسقدر تعلیم یافتہ ہیں کہ انکو شامل کرنے کے بعد بھی صرف ۶ فیصدی وہاں جاہل نظر آتے ہیں۔

امریکہ کی سپید (مسیحی) آبادی میں تو ایک متنفس بھی جاہل نہیں ہے اور یہ تعداد صرف حبشیوں او ان لوگوں کی ہے جو امریکہ میں پیدا نہیں ہوئے۔

امریکہ کا محکمۂ تعلیم، دفتر مردم شماری سے درخواست کرتا ہے کہ براہِ مہربانی جاہل آبادی کی فہرست نام بنام مرتب کر دیجائے اور جسوقت یہ فہرست محکمۂ تعلیم کو پہونچتی ہے تو وہ ایک ایک ناخواندہ فرد کو پڑھنے پر مجبور کرتا ہے اور تمام ضروری کتابیں اُسے مہیا کی جاتی ہیں۔ یہ ہے وہ طریقہ کار جس سے ایک ملک صحیح معنوں میں ترقی کر سکتا ہے۔ اسکے مقابلہ میں ہندوستان کی تعلیمی حالت ملاحظہ ہو۔

ھندوستان کا تعلیمی انحطاط

۱۹۱۱ء کی مردم شماری کے لحاظ سے یہاں ہر چار گانوں میں تین ایسے ہیں جہاں کوئی انتظام تعلیم کا نہیں ہے اور تقریباً تین کرور لڑکے جن کی عمر تعلیم کے قابل ہے، تعلیم سے محروم پھر رہے ہیں۔

ہندوستان کی ۳۲ کرور آبادی میں صرف ایک کرور بچاسی لاکھ نفوس (۱۶۹۰۰۰۰۰ عورتیں ۱۶۰۰۰۰۰ مرد) ایسے ہیں جنھیں ناخواندہ نہیں کہہ سکتے۔ یعنی صرف ۵ فیصد آبادی یہاں کی تعلیم ہے۔ برخلاف اسکے جاپان میں ۹۵ اور انگلستان و امریکہ میں ۹۴ فیصد آبادی تعلیمیافتہ ہے۔

ابتدائی تعلیم کے لئے ہندوستان میں ۱۴۲۲۰۳ مدارس ہیں، جن میں ۵۸۱۸۷۳۰ طلبہ (لڑکے ۵۱۸۸۴۱۱، لڑکیاں ۶۳۰۳۱۹) تعلیم پاتے ہیں اگر ان مدارس کو ساری آبادی پر تقسیم کیا

تو تقریباً ہر دو ہزار نفوس کے لئے صرف ایک مدرسہ نظر آتا ہے۔

تجارتی اور صنعتی تعلیم کا حال یہ ہے کہ ۱۹۱۸ء میں صرف ۱۲۵۹۴ طلبہ ایسے تھے جو کسی صنعت یا حرفت کی تعلیم پا رہے ہوں۔ اخباروں کو دیکھئے تو انکی حالت اور زیادہ سقیم ہے یعنی ۱۹۱۸ء میں اُن کی کُل تعداد ۳۹۷۰ تھی یعنی ہر دس لاکھ آدمیوں کیلئے بارہ اخبار۔ درآنحالیکہ امریکہ میں ہر دس لاکھ نفوس کے لئے ۲۲۵ انگلستان میں ۹۰۔ اور جاپان میں ۵۰۔ اخباروں کا شمار ہوتا ہے۔

ایک پونڈ کوئلہ کی قوت

بظاہر ایک۔ پونڈ کوئلہ (۷ چھٹانک) بے حقیقت سی چیز نظر آتا ہے لیکن آلات و جرثقیل کی دُنیا میں، اسکے کرشمے دیکھئے تو حیرت ہو جائے۔ ایک پونڈ کوئلہ ڈاک گاڑی کو ۵۰ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ۱/۲ میل تک ڈھکیلنے میں مدد دے سکتا ہے۔ ایک پونڈ کوئلہ میں دس ہزار اجزاء حرارت موجود ہوتے ہیں کہ اگر انکی پوری گرمی پانی کو پہونچائی جائے تو ۶۲۵ پونڈ (تقریباً ۸ من) پانی ایک فٹ اوپر اُٹھ جائے۔

اگر ۴۶ درجۂ حرارت سے اسکو ایک فٹ گہرے پانی میں روشن کیا جا سکنا ممکن ہوتا، تو پانی ۱۶ درجہ تک گرم ہو کر حمام کیلئے موزوں ہو سکتا۔ کوئلہ کی اس قلیل مقدار میں ۲۳۶ گھوڑوں کی قوت پنہاں ہے، جس کی مدد سے آٹھ گاڑیوں کی ایل ریل ۱/۵ منٹ میں ۱/۲ میل مسافت طے کر سکتی ہے۔

انسانی محنت و قوت سے اگر مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ایک پونڈ کوئلہ ایک منٹ تک پانچ آدمیوں کے برابر کام دے سکتا ہے۔ معمولی آرہ کو قوی سا قوی آدمی ایک منٹ میں ۶۰ مرتبہ کھینچ سکتا ہے اور صرف ۵ فٹ لکڑی اس طرح چیری جا سکتی ہے، گول آرہ اس سے ستر گُنا زیادہ کام کرتا ہے، پھر کیا یہ تعجب انگیز امر نہیں کہ ایک پونڈ کوئلہ ۱۸۰ گول آروں کو ایک منٹ تک متحرک رکھ سکتا ہے یعنی اسمیں ۱۲۶۰۰ آدمیوں کی قوت پنہاں ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی عجیب و غریب بات ہے کہ ایک پونڈ کوئلہ کی یہ قوت صرف یوروپ و متعلقات یوروپ میں پائی جاتی ہے، ورنہ ہندوستان بھی اس سے فائدہ اٹھاتا۔

نیاز

اشتراکیت
(Socialism)

اشتراکیت کا لغوی مفہوم یہ ہے کہ تمام افراد انسانی ہر چیز میں مشترک رہیں اور وہ فطرت کے تمام انعامات سے یکساں طور پر فائدہ اُٹھائیں۔ موجودہ سیاسی دُنیا میں جو اصطلاحی رنگ اِس لفظ کو دیا گیا ہے وہ بھی ہر چند اس لغوی مفہوم سے علیحدہ نہیں، تاہم اِس لفظ کی تاریخی تحقیق اسقدر مختصر نہیں ہے کہ ہر شخص صرف اِس علم پر اکتفا کر سکے، چنانچہ آجکی صحبت میں ہم اِس اصطلاح کی تاریخ سے بحث کرنا چاہتے ہیں۔

اشتراکیت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک "اشتراکیت محض"، دوسرے "اشتراکیت تعاون"۔ اشتراکیت محض کا مفہوم یہ ہے کہ تمام افراد انسانی متاع عالم میں یکساں طور پر شریک نظر آئیں اور اشتراکیت تعاون سے یہ مراد ہے کہ افرادِ انسانی تقسیم عمل کے ماتحت خدمات انجام دیں اور نفع یا نتیجہ میں سبکا مساوی حصہ ہو۔ اگر کوئی فرد فطرتاً اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر ہو تو ہیئت اجتماعی (سوسائٹی) اسکی اعانت کرے۔

اشتراکیت کا مقصد یہ ہے کہ جمہور کی مدد سے افراد انسانی کی عام حالت درست کیجائے اور یہی وہ نصب العین ہے، جسکے ماتحت اشتراکیین موجودہ نظام عالم کو اُلٹ دینا چاہتے ہیں۔

اشتراکیت کی گذشتہ تاریخ بہت قدیم ہے یہانتک کہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جسوقت سے دُنیا میں ملکیت یا تسلط کی تاریخ شروع ہوئی ہے، اسوقت سے اشتراکیت کے جراثیم بھی پائے جاتے ہیں۔ تاریخ عالم کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ جب کبھی اصحاب دولت نے غربا پر ظلم شروع کیا، اسوقت اشتراکی خیالات دُنیا میں رونما ہونے لگے۔ یونانِ قدیم میں، فالیاس کا اشتراکیت کو رواج دینا اسی بنا پر تھا۔ اِس نے ایک قانون مرتب کیا تھا جسمیں اِس نے لڑکیوں کا مہر صرف اصحاب دولت پر عاید کیا تھا اور غربا کو اِس سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ اسی طرح اِسنے مسئلہ تعلیم میں دولت افلاس کو دوش بدوش چلانے کی کوشش کی تھی۔

افلاطون نے جب یونانی جمہوریت کو مرتب کیا تو اِس نے لوگوں کے تین طبقے مقرر کئے۔ پہلا طبقہ متعلمین کا تھا جس میں تمام اعضاء حکومت شامل تھے، دوسرا طبقہ عامۃ الناس کا تھا جس میں مزارعین اور مزدوری پیشہ جماعت داخل تھی، تیسرا طبقہ فوج کا تھا۔ لیکن اسکے ساتھ زمین، عورت اور غلام

کو اپنے مشترک ملکیت قرار دیا تھا۔

دوسری صدی (ق۔م) میں اسرائیلیوں کی ایک جماعت جو فرقۂ اسینیہ (Essenes) کے نام سے موسوم تھی، بحرالمیت کے کنارے آباد ہوئی۔ ہرچند اس گروہ کی تعلیمات اور رسوم و عادات پر پردہ پڑا ہوا ہے، تاہم یہ ضرور ثابت ہے کہ یہ لوگ مال میں شریک تھے یہاں تک کہ نکاح کا رواج بھی ان میں نہ تھا۔ یہی حال ایک مسیحی فرقہ کرد کراٹیا نا کا تھا جو چھٹی صدی عیسوی میں معدوم ہو گیا۔ ہالینڈ میں بھی متعدد جماعتیں اشتراکی اصول پر قایم ہوئیں، جن میں بہت زیادہ مشہور وہ جماعت تھی جسے جرار گروٹ نے ۱۳۷۶ء میں قایم کیا تھا۔ دوسری صدی عیسوی میں ایک گروہ آڈمیٹا نمودار ہوا جو راستوں پر برہنہ پھرتا تھا اور عورتوں پر سب کے مشترکہ حقوق قایم تھے۔

جرمنی کے عہدِ اصلاح میں وہاں کی کاشتکار جماعت نے زمینداروں کو مجبور کیا کہ وہ زمین میں انھیں مساوی طریق پر شریک کریں۔ اس پر باہم سخت خونریزی ہوئی جو "جنگِ مزارعین" کے نام سے مشہور ہے ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ مسیحی جماعتوں نے مالداروں پر زور ڈالا کہ وہ اپنی دولت فقرا پر تقسیم کر دیں۔ الغرض ہر جگہ اور ہر زمانہ میں اشتراکی خیالات پیدا ہوئے، دولت و حکومت نے انکا مقابلہ کیا اور تسلط و مساوات کی اس جنگ نے دنیا میں بہت کچھ اضطراب و اضطرار پھیلایا۔ اشتراکی اصول پر عہدِ وسطیٰ میں متعدد کتابیں بھی تصنیف کی گئیں، جن میں سب سے زیادہ مشہور کتاب سیاہ تو ماس مور کی ہے جو ۱۵۱۶ء میں طبع ہوئی تھی۔

تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ متمدن دُنیا میں اشتراکی انجمنوں کی تعداد ہمیشہ بڑھتی ہی گئی، اور حکومت کی قوت اُنکے مقاصد کو فنا نہ کر سکی۔ یہاں تک کہ صرف ریاستہائے متحدہ امریکہ میں ان کی تعداد ستر تک پہونچگئی۔ فرانس میں بھی اصول اشتراکیت نے قوت حاصل کی حتیٰ کہ بابوف اور اس کے متبعین نے نظام حکومت کو اُلٹ دینے کا ارادہ ہی کر لیا تھا۔ اِن لوگوں کا خیال تھا کہ ملکیت اشیا میں سب کے حقوق برابر ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی شے مخصوص کو اپنی ملکیت قرار دیتا ہے تو وہ جمہور کا مجرم ہے۔ بابوف کے بعد اسکے متبعین میں اختلافات پیدا ہو گیا۔ بعض نے رسم نکاح کو بھی اصول اشتراکیت کے منافی قرار دیا اور دُنیا کے تمام شہروں کو تباہ و برباد کر دینے کا مشورہ دیا کیونکہ ان کے نزدیک مظالم کے مرکز یہی تھے۔

سان سیموں فرانسیسی (۱۷۶۰ - ۱۸۲۵ء) نے ایک نیا مذہب نکالا، جسے وہ "نصرانیت جدید" کہتا تھا اور اپنے اصول مخترعہ کے ذریعہ سے لوگوں کے عقاید مذہب و سیاست کی اصلاح کرنا چاہتا تھا۔ لیکن اسکی عمر نے وفا نہیں کی اور وہ جلد مر گیا۔ اسکے بعد اس کے تلامذہ کی ایک جماعت نے اخبارات خطبات اور تقریروں کے ذریعہ سے فرانس میں اس مذہب کی اشاعت شروع کی اور اپنی فصیح و بلیغ تقریروں سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگے، لیکن چونکہ سان سیموں کے اصول خود اسکے تلامذہ بھی اچھی طرح نہ سمجھے تھے اسلئے بعد کو آپس ہی میں اختلافات پیدا ہوئے اور اشتراکی حلقوں کی مالی حالت کمزور ہو گئی۔ حکومت نے بھی اس انتشار سے فائدہ اٹھا کر انھیں گرفتار کرنا شروع کیا اور اُن کی مرکزی قوت کو بالکل فنا کر دیا۔

سان سیموں کے بعد شارل فوریہ کا ظہور ہوا (۱۷۷۲ - ۱۸۸۳ء) اس کے اصول کچھ مختلف تھے۔ اسکا خیال تھا کہ ہئیت اجتماعی کی بنا دائمی ارتقاء پر ہے۔ جس زمانہ میں فوریا اور اسکے مقلدین ہئیت اجتماعی کی اصلاح کرنا چاہتے تھے اور حکومت کی مدد سے بے نیاز ہو کر کام کر رہے تھے، لوئی لوبلان نے اس بات پر زور دیا کہ حکومت تعین عمل اور تقسیم اجرت کو اپنے ہاتھ میں لے، لیکن لوئی کا یہ قول سان سیموں کے بالکل مخالف تھا، لیکن ۱۸۴۸ء میں اسکا امتحان کیا گیا۔ حکومت موقتہ کیطرف سے کارخانہ قایم کئے گئے، حکومت ہی کیطرف سے اجرت پر مزدور رکھے گئے، مگر اس کا نتیجہ سوائے پریشانی اور نقصان کے کچھ نہ نکلا اور اُس کی تعلیمات سے ملک میں اک اشتراکی بغاوت ہو گئی اور اشتراکیت کے حامیوں کو ناکامی نصیب ہوئی۔

برودون (۱۸۰۹ - ۱۸۶۵ء) کا دستور العمل لوئی کے خلاف تھا۔ وہ کہتا تھا کہ حکومت کو ہئیت اجتماعی کے لئے قوانین وضع کرنیکا کوئی اختیار حاصل نہیں ہے، لیکن چونکہ اس نے اپنے اصول کو مبہم طور پر پیش کیا تھا۔ اسلئے لوگوں کی توجہ اس کی طرف کم ہو گئی اور اُسے کامیابی نصیب نہ ہوئی۔

انگلستان میں رابرٹ اوین (۱۷۷۱ - ۱۸۵۸ء) نے اشتراکی خیالات کی اشاعت شروع کی لیکن وہ کامیاب نہیں ہوا۔ رابرٹ کے بعد اور بہت سی اشتراکی جماعتیں قایم ہوئیں جن کی تعداد ۱۳۰۰۸ تک پہونچتی ہے، لیکن ان میں سب سے زیادہ کامیاب انجمن روشڈایل تھی۔ اس انجمن نے

اسباب تجارت کا ایک عام و مشترک ذخیرہ فراہم کیا تھا۔ چند سال کے عرصہ میں اس نے غیر معمولی ترقی کرلی۔ اور ہر قسم کی تجارت اس کے ہاتھ میں آگئی، لیکن نتیجہ کے لحاظ سے یہ بھی بدقسمت ثابت ہوئی اور حکومت نے اسکو بھی فنا کرکے چھوڑا۔

اسوقت یورپ و امریکہ میں بہت سی اشتراکی انجمنیں پائی جاتی ہیں اور اکثر "اشتراکیت تعاون" کے اصول پر قایم ہیں۔ جرمنی میں بھی سعیٔ مشترک کے اصول پر مزدوروں کی متعدد جماعتیں نظر آتی ہیں جو ایک حد تک اپنے مقاصد میں کامیاب ہیں۔ لیکن نتیجہ کچھ امید افزا نہیں۔

الغرض اشتراکی اصول دنیا میں قدیم زمانہ سے چلے آتے ہیں اور کم و بیش ہر قوم میں ان خیالات کا نشو و نما ہوا، لیکن باوجود اسکے وہ ہمیشہ مد و جزر کی حالت میں رہے ہے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ جب کبھی کسی قوم میں اشتراکیت قبول کرنیکا مادہ قابل پایا جاتا ہے تو اسکی آگ بھڑک اٹھتی ہے اور جب وہ مادہ فنا ہوجاتا ہے تو اشتراکیت کی روح بھی مردہ ہوجاتی ہے۔

اسوقت دنیا کے بہت سے ملکوں میں علی الخصوص روس میں اشتراکیت کے جذبات کام کر رہے ہیں۔ اور اشتراکیت کے حامی اپنی تائید میں نہایت خوبصورت دلایل پیش کرتے ہیں، لیکن نظام فطرت نے کبھی اُن کی تائید نہیں کی اور نہ آیندہ اس سے یہ توقع کیجا سکتی ہے۔

نیاز

یارانِ نجد

(صرف بزم نگار کے لئے)

۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۱ء کو ٹھیک اس وقت، جب کہ آفتاب نصف النہار پر تھا، سرزمین اکبرآباد میں "نفسیات" کے متعلق اک عجیب وغریب انکشاف ہوا۔ ہمارے ایک کرمفرما جو دو سال قبل اپنی تصویر کو (حسن وشباب۔ ملفوف۔ بہ پیراہن۔ کاغذ" کہتے ہوئے) ہر شخص کے سامنے "بہ ستم مے رسد" کی صورت میں، ایک پندارِ تبسم کے ساتھ پیش کردیا کرتے تھے، انھوں نے اسی، ہاں، اسی تصویر کو باوجود اصرارِ احباب کے کسی کو نہیں دکھایا۔ اور جب انھیں معلوم ہوا کہ ان کے چند لمحات کی غیر حاضری میں وہ تصویر دیکھ لی گئی ہے، تو منہ میں کف لے آئے، جذبۂ انتقام سے آنکھیں سرخ کرلیں اور اپنی گرج سے در و دیوار پر رعشہ طاری کردیا۔

اگر صاحبِ تصویر کے ذوق میں کوئی انقلاب پیدا نہ ہوا تھا، تو انھیں کیسے معلوم ہوا کہ دیکھنے والوں کا مذاق اتنے عرصہ میں اسقدر بلند ہوگیا ہوگا کہ وہ اسپر مضحکہ اڑائیں گے۔؟

باوجود عدمِ تبدیلیٔ ذوق کے ذہانت بڑھ جانے کی مثال شاید یہ پہلی اور بالکل پہلی ہو۔

فریب کی سب سے زیادہ لطیف مثال وہ ہے کہ ہم کسی بات کا ذکر سننا تو جی سے چاہتے ہوں، لیکن اگر کوئی اسے شروع کرے، تو اک پُر معنی تبسم کے ساتھ "معاذاللہ" کہہ کر بیزاری کا بھی اظہار کردیں۔ دوسرے لوگ اس حقیقت سے آگاہ ہیں، اسی لئے وہ اس ذکر کی تکرار کرتے رہتے ہیں، لیکن اگر انھوں نے واقعی کسی دن یہ سمجھ لیا کہ "معاذاللہ" سے مقصود "حسنِ طلب" نہیں ہے، تو کیا پھر صرف "علم الاصنام" کی عریاں تصویریں ہمارے دوست کے ذوق کا ساتھ دے سکتی ہیں؟ ہمیں معلوم ہے کہ اس سوال کا جواب ہمیں کیونکر دیا جائیگا۔

"ہماری" دنیا میں سب سے زیادہ وہ دانشمند شخص، جس نے اپنے سوا سب کو احمق بنا رکھا

ہے، جھانسی اور آگرہ کے درمیان ایسی جگہ رہتا ہے، جہاں جی۔ آئی۔ پی ریلوے کے دونوں
اکسپرس نہایت ناوقت پہونچتے ہیں۔

داغ نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں اپنا دل اسکو اس طرح دیتا ہوں۔

"جیسے کوئی سوال کرتا ہے"

یہ حضرت حقیقتاً سوال کرتے ہیں، لیکن کوئی جواب دیتا ہے، تو اسے سُنتے اسطرح ہیں، گویا
جواب دینے والے نے خود التجا کی تھی کہ "ہماری بات سُن لیجئے"!

سوال تو صرف کشش کا ہے، گلاب خانہ یا میوہ کٹرہ کا نہیں۔ مکان میں ہر چند اک خصوصیت
سہی، طالب کی کشیدہ قامتی کا، مطلوب کی رعنائی کیلئے "ثقل مرکزی" ہونا مسلّم، لیکن دُنیا کا کسقدر
حسرت انجام واقعہ ہے کہ اُسکا کوئی نام بھی نہیں لیتا، جس نے "بہ یک گردشِ کلکِ الفت نگار"
محال کو ممکن اور ممکن کو "واقعۂ ذی حیات" ثابت کر کے دکھا دیا کیا دُنیا میں کوئی "مقدس" ہستی ایسی
ہے، جو میرے ساتھ اس مسئلہ میں ہم آہنگ ہو جائے؟

مہر عالمتاب کی روشنی میں، آفتاب کے نور جہاں افروز میں، آسمان کے نیچے خدا جانے
کتنی تمناؤں کا خون ہوتا رہتا ہے، لیکن وہ آرزو جو پوری ہونے کے بعد کسی حسین چہرہ میں رنگِ
انفعال پیدا کر جائے، اگر تمام خون گشتہ حسرتوں کا جواب نہیں ہو سکتی، تو کم از کم میرے ذوقِ "حسن نگر"
کیلئے تو بہت کافی سامان دلکشی اپنے اندر رکھتی ہے۔

اگر کسی مہینہ کی ۲۹ تاریخ کو کوئی تقریب ہونے والی ہو اور اسکی اطلاع کسی ایسے شخص کو دیجانی ہو،
جو کسی طرح ۴۸ گھنٹے سے قبل وہاں نہیں پہونچ سکتا، تو جدید عوائد رسمیہ کی رُو سے یہ اطلاع ۲۸ تاریخ
کو ذریعہ تار دینی چاہیئے۔

اُدھر تو یہ اہمیت کہ ذریعہ تار اطلاع دی! اِدھر یہ ندامت کہ ایسے پُرخلوص فرمان کی تعمیل نہ ہو سکی!
کیا تقریب کی شرکت اس منظر سے زیادہ پُرلطف ہو سکتی ہے کہ ایک غلطی پر ہے لیکن اسے تسلیم نہیں
کرتا، دوسرا سب کچھ جانتا ہے اور کہتا ہے "معاف فرمائیے"!

کبھی ہوں تو دل کھول کے کہوں جو کچھ کہتا ہے۔

ایک صاحب نے جو اس وقت جیل میں "رشک انگیز" حد تک اپنی پُرسکون زندگی بسر کر رہے ہیں، یہ کلیہ بتایا کہ جب کسی شخص کے نام کا آخری لفظ "دین" ہو اور اسکے قبل "الف، لام" نہ ہو تو سمجھ لو کہ وہ کبھی صحیح الذوق نہیں ہو سکتا۔

ہمیں خبر نہیں کہ یہ اطلاع کیونکر محفل راز سے باہر گئی، لیکن اسقدر ضرور جانتے ہیں کہ اُسی دن شام کو چاندنی چوک کی ایک دوکان کے سامنے سائن بورڈ (تختۂ دوکان) بنانے والا کہہ رہا تھا کہ "میں الف لام اسمیں بڑھائے دیتا ہوں" اور مالک دوکان کا اصرار تھا کہ "نہیں، تم تو از سرِ نو سارا نام لکھ دو، جگہ کم ہے، اگر الف لام چھوٹا رہ گیا تو؟"

ایک ہمارے دوست ہیں کہ اگر انکے متعلق کوئی سچی بات بھی کہی جائے، تو خفا ہو جاتے ہیں۔ فی الحال ہم اُنکی نسبت صرف اتنی ہی "راست گوئی" سے کام لیتے ہیں۔ الکنایہ کچھ "بدولت" کے پتہ سے ملتا جلتا ہے۔

ایک صاحب کی سمجھ میں آجتک یہ بات نہیں آئی کہ جب زمین اپنے تمام سمندروں کے ساتھ گردش کرتی ہے، تو پانی کیوں نہیں نیچے گر پڑتا۔ ایک دن جب گفتگو زیادہ طویل ہو گئی اور وہ بھی تنگ آگئے، تو کہنے لگے "خیر، فی الحال اس بحث کو ملتوی کیجئے، کیونکہ مجھے "کشتیوں کی گھوڑ دوڑ" میں جانا ہے"

اب بتایئے کہ اس "کشتیوں کی گھوڑ دوڑ" کا کیا علاج ہے۔؟

اسی گھوڑ دوڑ کے سلسلہ میں ایک اور بزرگ یاد آ گئے۔ اگر ان سے آپ کو ملنا مقصود ہو تو فوراً اخبار اٹھا کر معلوم کیجئے کہ ریس کہاں ہو رہی ہے۔ آپ وہیں پہونچ جایئے اگر ریس کے اوقات سے قبل آپ پہونچ جائیں تو آپ بھی جا کر [illegible] بیٹھ جائیے اور دیکھئے کہ کون شخص اکڑو بیٹھا ہوا اپنے سامنے [illegible] [illegible] اہل [illegible] کے متعلق تبادلۂ خیال کر رہا ہے۔ بس یہی صاحب گرفتار ہو جائیں گے [illegible] فرش پر ہو گئی ہے تو یہی میدان [illegible] وہاں سب سے زیادہ [illegible]

سب سے زیادہ فیشن ایبل، سب سے زیادہ گھبرایا ہوا شخص، جو ہاتھ میں صرف پانچ روپیہ کے نوٹ لئے ہوئے، کسی بک میکر کے تختے کے نیچے، پنجوں کی مدد سے قد کو اور زیادہ دراز بناتے ہوئے اپنے لانبے لانبے ہاتھوں سے نوٹوں کو بک میکر کی ناک میں فلیتہ بنا کر داخل کر دینے کے لئے کھڑا ہوا تلملا رہا ہو، وہی ہمارے دوست ہیں۔ جلّ جلالہٗ!

محبت کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ اسکا تعلق مادی دنیا سے بالکل نہیں ہے، لیکن ہمارے ایک دوست جنھوں نے اسکا مطالعہ ایک فن کی حیثیت سے کیا ہے، یعنی جو دنیا کی دوسری صنعتوں کی طرح، اسے بھی اک علم اکتسابی خیال کرتے ہیں، انکا قول ہے کہ "جو محبت غیر حقیقی (مگر بظاہر مکمل) رعنائیوں سے پیدا کی جاتی ہے، وہ نہایت مفید اور محفوظ محبت سمجھی جاتی ہے صبح و شام، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے صرف پندرہ روز تک "انعطاف" (Romance) کا لکچر دیا اور پہلا درجہ طے ہو گیا۔ اسکے بعد کے مدارج ذرا دشوار گذار ہیں، کیونکہ انکا تعلق شعبۂ ایثار سے ہے جہاں "دفع مضار" کی منزل میں ثابت قدم رہنا کسی معمولی آدمی کا کام نہیں۔"

لیکن اسی کے ساتھ جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ ہماری کوئی صحبت بغیر انکے مکمل نہیں ہوتی، ہماری محفل غم آلود نظر آتی ہے جبتک وہ "شیر بیشۂ محبت" موجود نہیں ہوتا اور میں بھی باوجود اس تمام علم کے اسی کا فرہ بردم دیتا ہوں، تو "صنعت گری" کے کرشموں کا آخر کار قائل ہونا ہی پڑتا ہے۔

ہمارے حافظ صاحب لیٹے لیٹے یہ شکایت تو ہر وقت کیا کرتے ہیں کہ "کیا کریں کام بالکل بند ہے، تجارت ماند پڑ گئی ہے" لیکن ان سے یہ نہیں ہوتا کہ "مراقبہ و سلوک" کی ایک تادیب گاہ قایم کر کے دنیائے تصوف میں اس انکشاف سے ہلچل ڈالدیں کہ "قطبیت" حقیقتاً نام ہے صرف "اپنی جگہ سے نہ ہلنے کا" نگار کا نمبر حاصل کرنے کے لئے محکمۂ ڈاک سے ابتک خط و کتابت نہ کرنا کیا کوئی ادنیٰ ثبوت قطبیت کا ہے؟

اُجرت نامۂ اشتہار رسالۂ نگار

تعداد طبع	ایک صفحہ	نصف صفحہ	ربع صفحہ
۱۲	نـہ ۹۶	للعہ ۹۴	عـہ ۹۳۰
۹	سـہ ۹۳۶	للعہ ۹۲۴	عـہ ۹۱۲
۶	للعہ ۹۲۴	عـہ ۹۱۶	سـہ ۸ ر
۳	عـہ ۹۱۲	سـہ ۸ ر	للعہ ر
۱	سـہ ر	للعہ ر	عـہ
پیشگی اجرت اشتہار دینا ہوگی	معاہدۂ اشتہار منسوخ نہیں ہوسکتا	مدت معینہ کے اندر مضمون اشتہار بدل سکتا ہے	کسی اشتہار کا جزبہ منظور نہیں کیا جائے گا

ٹائٹل کے اشتہارات کی اجرت نرخ نامہ سے ۲۵ فیصدی زیادہ ہوگی

"نگار"

(۱) ہر انگریزی ماہ کے تیسرے ہفتہ میں شائع ہوجائے گا، اس لیے اگر ۳۰ تک نہ پہونچے، تو ہمیں مطلع فرمائیے۔
(۲) چونکہ اک مشترکہ سرمایہ سے شائع ہوتا ہے اس لیے مالی مشکلات کی وجہ سے اس کے بند ہونے کا خیال دل میں نہ لائیے
(۳) بارہ روپیہ میں ایک سال تک تین روپیہ میں ۶ ماہ تک آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا رہے گا۔ اس سے کم مدت کے لیے درخواست خریداری آپ کی شان کے منافی ہے اس لیے ہم بھی اس کی تعمیل سے احتراز کریں گے۔
(۴) پیشگی قیمت روانہ کرنے کا مشورہ آپ کو دینا ہے، کیونکہ وی۔ پی میں آپ کا نقصان ہے، جو ہمیں کسی طرح گوارا نہیں ہوسکتا، البتہ اگر آپ چاہیں تو ہر ماہ ۸ ر کے ٹکٹ بھیجکر رسالہ حاصل کرسکتے ہیں۔

منیجر نگار
(آگرہ)

حافظ امام الدین منیجر نگار نے باہتمام خواجہ صدیق حسین مطبع آگرہ اخبار میں چھپوا کر شائع کیا۔

معین الدین مشین مین اکبرآبادی